© rasailojaraid.com

پارلیمنٹ اور اجتہاد

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

دورِ حاضر میں پارلیمنٹ (PARLIAMENT) کو مجلس منتظمہ کے ساتھ ساتھ ملک کی مقننہ (قانون ساز (LAW MAKER LEGISLATOR) ادارے کی حیثیت بھی حاصل ہے، اپنی اس حیثیت میں ملک کی "پارلیمنٹ" آزادانہ طور پر قانون سازی کرتی ہے۔ ہر طرح کے قواعد وضوابط تشکیل دیتی ہے اور سابقہ قوانین میں نظر ثانی اور اصلاح وترمیم کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اس میدان میں پارلیمنٹ کو اعلیٰ ترین قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جن کے لیے اکثر اوقات اسے "اجتہاد" کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا شرعاً ہمارے ملک کی پارلیمنٹ کو مقننہ ہونے کے ناطے "اجتہاد" کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

اس عنوان پر کچھ عرض کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ہم پہلے "اجتہاد" کی تاریخ اس کی حقیقت واصلیت پر گفتگو کر کے یہ تعین کر لیں کہ اس کا مفہوم کیا ہے یہ تعین اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ بحث انتہائی اہم اور نازک ہے اور مفہوم ومعنی میں ذرا سی تبدیلی بھی فیصلہ کن اثر ڈالتی ہے۔

۱۔ اجتہاد:

اجتہاد (DILIGENCE) کا مادہ جُہد (ج۔ ھ۔ د) ہے جس کے معنی کوشش، محنت اور سعی کرنے کے ہیں یوں اجتہاد کے معنی ہوئے:

استفراغ الوسع فی تحصیل امرٍ من الامور مستلزم للکلفۃ والمشقۃ ولهٰذا یقال اجتهد فی حمل الحجر ولایقال اجتهد فی حمل الخردلۃ[1]

---

[1] محمد اعلیٰ التہانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، ۱: ۱۹۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ: کسی قابل مشقت و کلفت کام کے انجام دینے میں مقدور بھر کوشش کرنا اسی لیے اس مادے کا استعمال پتھر اٹھانے میں ہوتا ہے "رائی" اٹھانے میں نہیں۔

جبکہ اصطلاحاً اجتہاد کی تعریف یہ ہے:

بذل المجهود فی طلب المقصود من جهة الاستدلال[1]

ترجمہ: کسی مقصد کو پانے کے لیے "استدلال" کے پہلو سے اپنی تمام کوشش صرف کر دینا۔

علامہ محمد اعلیٰ التھانوی۔ اس کی یہ تعریف فرماتے ہیں:

استفراغ الوسع لتحصیل ظنّ بحکم شرعی[2]

ترجمہ: ظن (گمان) کے درجے میں کسی شی کے حکم شرعی کو تلاش کرنے کے لیے اپنی تمام کوشش صرف کر دینا۔

اس طرح گویا اس بات پر تمام فقہا متفق ہیں کہ "اجتہاد" تب بنتا ہے جب "مجتہد" "خالی الذہن" ہو کر کسی معاملے کے شرعی حکم کو دریافت کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش اور ہمت صرف کرے۔ اور تمام ممکنہ ذرائع معلومات سے استفادہ کر کے اس کے صحیح تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ پھر علامہ الجرجانی نے جو "جہت استدلال" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ مجتہد کی مجتہدانہ کاوشوں کا مرکز توجہ "استدلال" اور "مراجع استدلال" ہونے چاہئیں، نہ کہ اس سے اخذ کردہ نتیجے کی موشگافیاں۔ اسی طرح۔ شیخ محمد اعلیٰ التھانوی نے جو "لتحصیل ظن" (ظن کے درجے میں حکم) کا جو جملہ بڑھایا ہے، لہٰذا اگر اس سے بہتر کوئی دلیل مل جائے جس کے نتیجے میں اس حکم کو تبدیل کرنا پڑے تو نہ تو "مجتہد" کو اس کے قبول کرنے میں تردد سے کام لینا چاہیے اور نہ ہی، اس کے کسی مقلد و متبع کو اس سے ہچکچانا چاہیے۔ کیونکہ بہرحال اجتہاد سے اخذ کردہ نتیجہ قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اور آخر تک اس میں تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے۔

---

[1] الجرجانی: التعریفات، ص ۵

[2] التھانوی: کشاف، ۱: ۱۹۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجتہاد کا دائرۂ کار

اس وضاحت سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نہ تو قرآن و سنت اور اجماع امت کے مقابلے میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور نہ اجتہاد سے حاصل کردہ حکم، قرآن و سنہ کی طرح قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے یہ بات تو متعیّن ہو گئی کہ کوئی بھی ادارہ بشمول پارلیمنٹ قرآن و سنہ اور "اجماعِ امت" کے مقابلے میں اجتہاد نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس نے ایسا کیا تو وہ قطعی اور یقینی طور پر باطل و مردود ہوگا۔ اجتہاد کے جواز پر قرآن و سنہ اور اجماع امت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ قرآن مجید اور اجتہاد:

قرآن مجید میں بالصراحت تو کسی جگہ بھی "اجتہاد" کرنے کا حکم مذکور نہیں ہے، البتہ چند مقامات پر قرآنی آیات کے فحوائے کلام یعنی بین السطور سے اس کی اجازت و مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا [1]

ترجمہ: اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے لیے کوشش کی، ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھا دیں گے۔

مفسّرین کرام نے اس سے اجتہاد کا جواز ثابت کیا ہے؛ اسی طرح دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ [2]

---

۱ العنکبوت : ۶۹

۲ النساء : ۸۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ: اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے، تو وہ اسے مشہور کر دیتے ہیں، اور اگر وہ اسے اپنے پیغمبر اور سرداروں کے پاس لے جاتے، تو تحقیق کرنے والے، (یا استنباط کرنے والے) اس کی تحقیق کر لیتے۔

اس آیت میں گو لفظ "استنباط" استعمال ہوا ہے مگر چونکہ اجتہاد اور استنباط دونوں کا دائرہ کار قریب قریب ہے۔ اس لیے گویا یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو، اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کے رؤسا کے پاس لانا چاہیے تاکہ وہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔ اسی مفہوم کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت وسیع مفہوم رکھتی ہے: کہ اس سے ایک طرف تو اجتہاد و استنباط کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب یہ آیت مبارکہ عوام الناس کے لیے "وجوب تقلید" کی تاکید پر مشتمل ہے، اس لیے کہ جب دنیوی معاملات میں انھیں از خود فیصلہ کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ تو دینی معاملات میں تو، بدرجۂ اولیٰ یہ ممانعت مؤثر ثابت ہوگی۔ کیونکہ "دینی معاملات" میں جتنے حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر دنیوی معاملات میں حزم و احتیاط اگر اس سے دس گناہ کم بھی ہو، تو کام چل جاتا ہے۔ اسی طرح امام شافعی نے اپنی کتاب "الرسالۃ" کی فصل اجتہاد[1] میں سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۱۴۵ سے جواز اجتہاد پر استدلال کیا ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ[2]

ترجمہ: اور اگر تو ان اہل کتاب کے پاس تمام نشانیاں بھی لے آئے تو بھی وہ تمہارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے اور تم بھی ان کے قبلے کی پیروی نہ کرو گے اور نہ ہی ان میں سے بعض بعض کے قبلے کی پیروی کریں گے۔

امام شافعیؒ نے "اجتہاد" اور "رائے" کو باہم "مترادف" قرار دیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک مجتہد

---

[1] الرسالہ۔ مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۱۲ھ، ص ۱۲۷

[2] البقرہ۔ ۱۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ شخص ہے جو "ماخذ فقہ" پر نظر ڈال کر کسی بھی معاملے میں اپنی ذاتی رائے قائم کرے[1]۔ امام شافعیؒ کی اس دقیع رائے سے "حنفی علماء" کے متعلق کیے جانے والے اس پروپیگنڈے کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ جو ان کے لقب "اصحاب الرائے"، کی بنیاد پر کیا جاتا۔ اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "ائمہ احناف" کے متعلق ابتدائی صدیوں میں بکثرت استعمال کیا جانے والا مذکورہ لفظ ان کی تنقیص و مذمت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تو ان ائمہ کی شان دو بالا کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ حنفی فقہاء "اصحاب الاجتہاد" یا "مجتہد عصر" تھے، جو ان ائمہ کی صفت کمال تو ہے صفت قبح و مذمت نہیں۔

۲۔ احادیث اور اجتہاد:

قرآن مجید کے بعد، جب ہم ذخیرۂ احادیث پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں قدم قدم پہ اجتہاد کی اہمیت و ضرورت اور اس کے جواز کا پتہ چلتا ہے۔ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات حسب ذیل ہیں:

ا۔ حدیث معاذ:

حضرت معاذ بن جبلؓ[2] سے مروی ہے کہ انھیں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "یمن" کا گورنر بنا کر بھیجا، تو ان سے پوچھا:

کیف تقضی اِذا عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ قال فان لّم تجِد فی کتاب اللہ قال فبِسُنّۃ رسول اللہ قال فان لّم تجد فی سُنّۃِ رسول اللہ ولا فی کتاب اللہ قال اجتہد برأیی ولا اٰلو۔

ترجمہ: جب تیرے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوگا، تو کیسے فیصلہ کرے گا؟ عرض کیا کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، فرمایا: اگر اس مسئلے کا ذکر کتاب اللہ میں تجھے نہ ملا، تو پھر؟ عرض کیا۔ پھر میں اس کے رسول کی سُنّت کے مطابق فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر تجھے اس بارے میں قرآن مجید اور سنت رسول میں بھی اس کا ذکر نہ ملا، تو کیا کرو گے، عرض کیا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہ کرونگا۔

---

[1] الرسالہ، مذکور۔

[2] ابوداؤد: الجامع السنن، ۴: ۱۸۔۱۹؛ حدیث ۳۵۹۳-۳۵۹۴؛ الترمذی: الجامع السنن، حدیث ۱۳۲۷، کتاب الاحکام۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قرآن و سنت کی روح کے مطابق فیصلہ کرنا اور اس کے لیے اپنی پوری کوشش کرنا عین منشائے اسلام ہے۔

ب۔ حدیث عمرو بن العاص:

مشہور صحابیٔ رسول اور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إذا حكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حكم فاجتهد فاخطأ فله اجر۔[1]

ترجمہ: جب کسی معاملے میں کسی حاکم نے فیصلہ کیا بشرطیکہ اس نے اس میں خوب اجتہاد کیا ہو، تو اگر اس کا فیصلہ درست ہوا، تو اسے دوہرا ثواب ملے گا (ایک صحیح فیصلہ کرنے کا اور دوسرا اجتہاد کرنے کا) اور اگر اس نے اجتہاد کے باوجود غلطی کی تو اسے ایک اجر ملے گا (اجتہاد کرنے کا)۔

ج۔ ایک اور حدیث میں یہ الفاظ مروی ہیں، کہ:

اجتهدوا فكلّ ميسّر لما خُلِقَ له۔

ترجمہ: تم اجتہاد کرو، اس لیے کہ انسان کو وہ شئے مل کر رہتی ہے۔ جو اس کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

۳۔ تعامل صحابہ

ا۔ عمل صدیق اکبرؓ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول تھا! اسی لیے مروی ہے کہ جب انہیں کسی مسئلے کا قرآن مجید اور احادیث میں واضح حکم نہ ملتا، تو وہ لوگوں کو جمع کر کے۔ ان سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور جب کسی رائے پر تمام صحابہؓ متفق ہو جاتے، تو اسی رائے پر عمل کیا جاتا! اور یہ بھی روایت ہے

---

[1] البخاری، کتاب الاعتصام، ۹/ ۱۳۲۔
مسلم، کتاب الاقضیہ، ۳: ۱۳۴۲۔ حدیث ۱۷۱۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ ذاتی اجتہاد کے بعد فرمایا کرتے تھے : یہ میری رائے ہے ، اگر درست ہو ، تو اللہ تعالیٰ کی جانب ہے اور اگر غلط ہو ، تو میری طرف سے ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں :

ب ۔ عمل عمر فاروق رضؓ :

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضؓ کے متعلق مروی ہے ۔ کہ

"حضرت عمر رضؓ کا طرز عمل یہ تھا کہ جب کسی مسئلے کا حکم صریحاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہوتا تھا ۔ تو آپ صحابہ کرام رضؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ لیتے اور جو کچھ کہا جاتا اس کو بحث و تمحیص کے بعد قبول کر لیتے ۔ اور جب تک ہر ایک قسم کا شبہ دور ہو کر ان کو کامل اطمینان نہیں ہو جاتا تھا ، اس وقت تک وہ بحث و مناظرے کا سلسلہ جاری رکھتے تھے ۔ اسی لیے ان کے فیصلوں اور فتووں کو اہل علم کے حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ، اسی بنا پر جب حضرت عمر رضؓ کا انتقال ہوا ، تو ابراہیم نخعی رحؒ نے ، (جو امام ابوحنیفہ رحؒ کے استاذ الاستاذ) ہیں کہا کہ آج علم کے $\frac{9}{10}$ حصے دنیا سے اٹھ گئے ہیں[1]"

حضرت عمر فاروق رضؓ کا ارشاد :

اسی طرح مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے حضرت شریح کو کوفے کا قاضی مقرر کیا ، تو ان سے فرمایا :

"اللہ کی کتاب میں غور کرنا اور اگر تجھے اس میں حکم مل جائے ، تو کسی سے دریافت نہ کرنا اور اس میں نہ ملے ، تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تلاش کرنا اور اگر سنت میں نہ ملے ، تو اپنی رائے پر عمل کرنا "

ان تمام حوالہ جات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں مختلف مسائل و معاملات کے حل کے لیے " اجتہاد " کی ضرورت و اہمیت کو نہ صرف تسلیم کیا گیا ہے ۔ بلکہ اس کے ذریعے مسائل و معاملات کے حل پر زور دیا گیا ہے ۔

۴ ۔ اجماع اُمّت

پھر اسی پر اُمّت کا اجماع بھی ہے کیونکہ فقہی مسائل کے حل کے لیے " اجتہاد " کا ادارہ قرنِ اوّل

---

[1] شاہ ولی اللہ : حجۃ اللہ البالغہ ، ۱ : ۶۱۶ ۔ (اردو ترجمہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی میں معرض وجود میں آگیا تھا، چنانچہ بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی عدم موجودگی میں "اجتہاد" و استقراء سے کام لیا کرتے تھے، اور آپ نے متعدد احکام و مسائل کا اسی ذریعے سے استخراج فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں ارشاد ہے:

انّ الصّفا والمروة من شعائر الله [1]

ترجمہ: بے شک صفا و مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر (نشانات) میں سے ہیں۔

اس سے آپ نے یہ حکم استنباط کیا کہ حج و عمرہ میں سعی کی ابتدا صفا سے کی جائے۔ آپ فرماتے ہیں:

ابدؤا ما بدأ الله تعالیٰ به۔

ترجمہ: اسی سے آغاز کرو جس سے اللہ تعالیٰ نے آغاز کیا ہے۔

یا سورج اور چاند کے گرہن کے وقت نماز ادا کرنا، یا وقت عذر استقبال قبلہ کی فرضیت کا ساقط ہونا وغیرہ، کہ ان مسائل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود اجتہاد سے کام لیا ہے [2]

عہد نبوی کی طرح عہد خلفائے راشدین میں بھی وسیع پیمانے پر اس "ذریعے" سے کام لیا گیا چنانچہ ہمیں اس عہد کے مجتہدین کی فہرست میں اکثر صحابہ کرام کے اسمائے گرامی ملتے ہیں، جن میں خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ، عبادلہ ثلثہ (حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس) ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابو ذر الغفاریؓ اور اسی طرح کے دیگر اکابر صحابہ شامل ہیں۔

صحابہ کرامؓ سے یہ علم تابعین کے سینوں میں منتقل ہوا اور ان کے بعد تبع تابعین اس کے وارث بنے۔ جن میں بطور خاص ائمہ اربعہ۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا نام قابل ذکر ہے، جنہوں نے خصوصی طور پر اس شعبے کو ترقی دی اور تمام عصری مسائل کا حل اس کے ذریعے تلاش کر کے امت کے سامنے پیش کیا۔

ان ائمہ کرام میں سے امام ابو حنیفہؒ کا ذکر خصوصی توجہ کا مقتضی ہے۔ کیونکہ ان کے طرز عمل کو

---

[1] البقرہ ـ ۱۵۸

[2] حجة اللہ البالغہ، ۱: ۵۲۳، ۵۲۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"پارلیمنٹ" میں اجتہاد کے لیے ایک مثال بنایا جا سکتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے سوانح نگاران کے متعلق لکھتے ہیں:

"امام ابوحنیفہؒ نے جس طریق سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا تھا وہ نہایت وسیع اور دشوار کام تھا، اس لیے انہوں نے اتنے بڑے اور اہم کام کو محض اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا، اس غرض سے انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے چالیس نامور اشخاص منتخب کیے، اور ان کی ایک مجلس بنائی۔ الطحاوی نے ان میں سے تیرہ کے نام دیے ہیں۔ جن میں امام ابویوسف اور امام زفر نمایاں شخصیتیں تھیں۔ اس طرح گویا فقہ کا ایک ایسا ادارۂ علمی تشکیل پذیر ہو گیا، جس نے امام ابوحنیفہؒ کی سرکردگی میں تیس برس تک کام کیا" امام اعظم کی زندگی ہی میں اس مجلس کے فتاویٰ نے حسن قبول حاصل کر لیا تھا۔ جیسے جیسے یہ فتاویٰ تیار ہوتے جاتے، ساتھ ہی ساتھ تمام ملک میں پھیلتے جاتے تھے۔[1]

چنانچہ صاحب "قلائد عقود العقیان" نے "کتاب الصیانہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام صاحبؒ نے اس طریقے سے جو مسائل مدوّن کیے، ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔

اس مجلس میں مسائل کو باہمی تبادلۂ خیال اور پوری بحث و تمحیص کے بعد "مدوّن" کیا جاتا تھا، اور اس کے متعلق مجلس میں شریک ہر فرد کی رائے لی جاتی تھی۔ اس مجلس میں حدیث و سیرت کے ماہرین بھی تھے اور رائے و قیاس کے متبحرین بھی۔ اس طرح باہمی تبادلۂ خیال کے بعد جو رائے سامنے آتی تھی، وہ ہر پہلو سے مکمل اور جامع ہوتی تھی۔ افسوس کہ اس طریق کار کو امام ابوحنیفہؒ کے بعد جاری نہ رکھا جا سکا، ورنہ شاید امت اس اختلال و انتشار تک نہ پہنچتی۔ جو ایسے ادارے کی عدم موجودگی میں پیدا ہوا اور اب تک جاری و ساری ہے۔

ائمہ اربعہ کے بعد ان کے گرامی قدر شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے اس مشن کو آگے بڑھایا اور

---

[1] J. Schacht مقالہ ابوحنیفہ، در انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، لائیڈن؛ نیز در اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ۱: بذیل مادہ (۱: ۷۴۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجتہاد و استنباط کے اساسی قوانین منضبط کیے۔ حنفی فقہ کو آگے بڑھانے والوں میں امام ابو یوسفؒ
(۱۱۳ھ/ ۷۳۱ء تا ۱۸۲ھ/ ۷۹۸ء)، امام محمد بن الحسن الشیبانی (۱۳۱ھ/ ۷۴۸ء تا ۱۸۹ھ/ ۸۰۴ء)،
الحسن بن زیاد اللؤلؤی (م ۲۰۴ھ) عیسیٰ بن ابان (م ۲۲۱ھ)، ہلال بن یحییٰ بن مسلم الرای البصری المعروف
بہ ہلال الرای (م ۲۴۵ھ/ ۸۵۹ء)، ابو عبد اللہ محمد بن سماعہ التمیمی (م ۲۳۳ھ/ ۸۴۷ء)، احمد بن
الخصاف (م ۲۶۱ھ/ ۸۷۴ء) اور آخر میں امام الطحاوی وغیرہ شامل ہیں۔

جبکہ فقہ مالکیہ امام مالک ابن انس الاصبحی (۹۳ھ/ ۷۱۱ء تا ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء) کے شاگردوں
کے ذریعے پھیلی، جن میں ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن مسلم القرشی (فقیہ مصر، م ۱۹۷ھ/ ۸۱۲ء)،
ابو عبد اللہ عبد الرحمان بن القاسم العتقی (م ۱۹۱ھ/ ۸۰۶ء)، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الحکم (م ۲۱۴ھ
۸۲۹ء)، اشہب بن عبد العزیز القیسی (م ۲۰۴ھ/ ۸۱۹ء)، ابو عبد اللہ زیاد بن عبد الرحمان القرطبی
(فقیہ اندلس) (م ۱۹۳ھ/ ۸۰۸ء) عبد السلام بن سعید التنوخی، الملقب بہ سحنون (م ۲۴۰ھ/ ۸۵۴ء)
وغیرہ شامل ہیں۔

فقہ شافعی، جو زیادہ تر مصر، لبنان، فلسطین، اردن، عراق، حجاز اور یمن وغیرہ میں اشاعت پذیر
ہوئی، امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس الشافعی (۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء تا ۲۰۴ھ/ ۸۱۹ء) کے نامور شاگردوں کے
ذریعے ان اطراف و اکناف میں اشاعت پذیر ہوئی۔ امام شافعی کے جن تلامذہ نے ان کی فقہ کو آگے
بڑھانے میں قائدانہ رول ادا کیا، ان میں ابو ثور ابراہیم بن خالد بن ابی الیمان الکلبی البغدادی (م ۲۴۰ھ/
۸۷۳ء)، ابو یوسف بن یحییٰ البویطی المصری (۲۳۱ھ/ ۸۴۵ء)، ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ المزنی (م ۲۶۴ھ/
۸۷۷ء)، ربیع بن سلیمان بن عبد الجبار المرادی (م ۲۷۰ھ/ ۸۸۳ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ/ ۷۸۰ء تا ۲۴۱ھ/ ۸۵۵ء) جو فقہ حنبلی کے بانی ہیں۔ امام شافعیؒ کے نامور
شاگرد تھے۔ انکی فقہ احمد بن محمد بن ہانی المعروف بہ ابو بکر الاثرم، اسحٰق بن ابراہیم المعروف بہ ابن راہویہ،
المروزی، ابو القاسم الخرقی، ابن قدامہ الحنبلی، ابن تیمیہ، اور ابن القیم (م ۷۵۱ھ/ ۱۳۵۰ء) کے
ذریعے پھیلی۔

اس طرح "امت" نے بالاتفاق اجتہاد کے ذریعے اپنے جملہ مسائل و معاملات کا حل تلاش
کیا اور وقت کے تقاضوں کی تکمیل فرمائی۔ اگر اسلام میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہوتی، یا اجتہاد کا یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمل جاری نہ ہوتا، تو اُمّتِ مسلمہ کو اپنے صدیوں کے سفر میں جن مصائب و مسائل کا سامنا کرنا پڑتا، اس کا تصور ہی سوہان روح ہے۔

۵۔ اقوال ائمہ کرام

ائمہ کرام کے ذاتی عمل، زندگی بھر کی شبانہ روز محنت اور بے پناہ علمی کاوشوں کے علاوہ جن کی داد نہ دینا، بہت بڑی کوتاہی ہے۔ ان کے اقوال سے بھی "اجتہاد" کی ضرورت و اہمیت کا اثبات ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

لا یحل لاحدٍ ان یقول بقولنا حتّٰی یعلم من این قُلنا۔

ترجمہ: کسی کو یہ جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول کی پیروی کرے، جب تک کہ وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے یہ موقف کس بنا پر اختیار کیا ہے۔

جبکہ امام مالکؒ کا قول ہے:

انما انا بشر اخطی واصیب انظرو فی رائی کلما وافق الکتاب والسنۃ فخذو بہ وما لم یؤافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ۔

ترجمہ: میں بھی ایک انسان ہوں، غلط فیصلہ بھی دے سکتا ہوں اور صحیح بھی، لہٰذا تم میری رائے پر غور کیا کرو، پس جو رائے کتاب و سنت کے مطابق ہو، اسے اختیار کرو اور جو رائے قرآن و سنۃ کے خلاف ہو، اسے چھوڑ دو۔

چنانچہ اسی بنا پر امام مالکؒ نے مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ لوگوں کو مالکی مذہب اختیار کرنے کی ترغیب دے۔

اسی طرح امام شافعیؒ سے مروی ہے کہ:

ما قلت وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد قال بخلاف قولی فما صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اولی ولا تقلدونی واذا صح خبرٌ یخالِف مذھبی فاتبعوہ واعلموا انہٗ مذھبی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ: اگر میرا کوئی قول، فرمان نبوی کے خلاف ہو، تو اس وقت میری تقلید نہ کرو اور اگر کوئی ایسی صحیح حدیث مل جائے، جو میرے قول کی مخالف ہو، تو میرا قول چھوڑ کر اسی کی تقلید کرو اور جان لو کہ وہی میرا مسلک ہے۔

علیٰ ہذا القیاس امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

لا تقلدونی ولا مالکاً ولا الشافعی ولا الثوری وخذوا من حیث اخذوا[1]

ترجمہ: تم نہ میری تقلید کرو، نہ امام مالک، امام شافعی اور امام الثوری کی۔ بلکہ انہیں ماخذوں کو پیش نظر رکھو، جو ان ائمہ کے پیش نظر تھے۔

پھر جس طرح ابتداءً مجتہد کو اپنی رائے قائم کرنے کا حق رہتا ہے، اسی طرح بعد میں بھی وہ اپنی رائے تبدیل کرنے کا مجاز تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری ایک خط میں تحریر فرمایا تھا:

"جو فیصلہ تم نے آج کیا پھر تم نے اس فیصلے سے رجوع کرتے ہوئے اپنی صائب رائے سے صحیح فیصلہ کر لیا، تو اپنے سابق فیصلے کو چھوڑ کر حق کی طرف رجوع کرنے میں دریغ نہ کرو، کیونکہ حق قائم و دائم رہتا ہے اور کوئی شی اسے حق ہونے سے نہیں روک سکتی، لہٰذا حق کی طرف رجوع کرنا زیادہ عرصہ باطل پر رہنے سے بہتر ہے[2]

اس سے واضح ہوا کہ اجتہاد تسلسل سے جاری و ساری رہنے والا ایک عمل ہے۔ یہ ہر دور اور ہر زمانے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا کوئی باب بھی رقم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مجتہد اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، کوئی فیصلہ صادر کر دے، تو اس کے باوجود اس مسئلے میں نہ تو خود اس کے لیے اجتہاد کا دروازہ بند ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے کسی شاگرد، مقلد اور متبع کے لیے اس مسئلے میں غور و فکر کرنے کی گنجائش اختتام کو پہنچتی ہے۔ لہٰذا "مجتہد فیہ" (ایسے مسائل جن میں اجتہاد

---

[1] المحمصانی: فلسفۃ التشریع الاسلامی، ص ۲۲۱-۲۲۲۔

[2] الماوردی: الاحکام السلطانیہ، ص ۶۸؛ ابن عبد ربہ: العقد الفرید، ۱: ۴۸۔ وغیرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے فیصلہ کیا گیا ہو) مسائل کے متعلق عوام وخواص میں جو تعصب و تشتّت پایا جاتا ہے، جس نے اُمت مسلمہ پر "جمود" و سکوت کی کیفیت طاری کر دی ہے ہمیں اسلام میں اس کی گنجائش نظر نہیں آتی، المحمصانی اپنی کتاب فلسفۃ التشریع الاسلامی میں لکھتے ہیں:

"مذکورہ بالا تمام دلائل سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ شرع میں اندھی تقلید جائز نہیں اور یہ کہ اجتہاد ہر اس شخص پر فرض ہے جو عالم ہو اور اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان دلائل سے ایک اور مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے وہ یہ کہ مجتہد کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی!

اجتہاد کے واجب ہونے تقلید کے ممنوع ہونے سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ جب کسی مجتہد یا قاضی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے اپنے سابقہ فیصلے میں غلطی کی ہے، تو اسے اپنے اس غلط فیصلے کی پابندی لازم نہیں"[1]

تاہم، جیسا کہ ہم آئندہ ذکر کریں گے، اجتہاد کے لیے بہت سی شرائط ہیں اور اجتہاد کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ اس لیے جہاں اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہاں ان تقاضوں اور شرائط کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ جن کے بغیر "اجتہاد" اجتہاد کے بجائے زندقہ اور الحاد قرار پاتا ہے۔

دورِ جدید کے تقاضے اور فقہ اسلامی

(MODERN AGE)

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ "دورِ حاضر" یا "دورِ جدید" کے تقاضے کیا ہیں اور ان تقاضوں کو "اسلامی فقہ" کیونکر پورا کر سکتی ہے؟۔

یوں تو بعض "تجدد پسند" روایتی انداز میں "مذاہب پرستوں" پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"انسان چاند پر چلا گیا ہے اور یہ لوگ آج بھی فرسودہ باتوں کو لے کر بیٹھے ہوئے ہیں"!

ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انسان کے چاند پر قدم رکھ لینے سے تمام قدیم مذاہب اور آسمانی کتب بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ابھی تو انسان نے چاند پر ہی اپنے قدم پہنچائے

---

[1] المحمصانی، ص: ۲۲۲ تا ۲۲۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، لیکن اگر کسی زمانے میں انسان نے مریخ پر اپنی آبادی بھی قائم کرلی، یا حضرت انسان، نظامِ شمسی کے دائرہ اثر سے نکل کر، کسی اور نظام تک بھی پہنچ گیا، تو تب بھی وہ مذاہب کی مہیا کردہ روشنی سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ "جدت پرست" مذہب اور فقہ کے معاملے میں تو یہ چاہتے ہیں کہ ان سے فقہ اور قانون کی پابندی ہٹالی جائے، اور ہر انسان کو مکمل آزادی دے دی جائے، لیکن وہ باقی معاملات میں پرانی ڈگر پر ہی چلنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں: وہ آخر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آج کا انسان بھی اسی ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ جس ہوا میں آج سے ہزارہا سال پہلے کا غیر متمدن انسان سانس لیا کرتا تھا۔ وہ اسی زمین پر رہنے، زندگی گذارنے پر مجبور ہے، جس زمین پر، برہا برس سے انسان بستے، رہتے اور زندگی گذارتے چلے آئے ہیں۔ وہ وہی اشیاء کھا رہا ہے، جن اشیاء کو اس کے قدیم بزرگ کھایا کرتے تھے، وہ اسی سورج سے روشنی حاصل کر رہا ہے، جو سورج اس کے آباؤ اجداد پر اپنی روشنی بکھیرا کرتا تھا، وہ انہی فضاؤں اور وادیوں میں چلتا پھرتا ہے۔ جن فضاؤں اور وادیوں نے اس کے اسلاف کے قدم چومے تھے۔ تو جب زندگی کا مجموعی ڈھانچہ وہی ہے، جو آج سے سینکڑوں برس پہلے تھا، تو وہ اخلاقی اور نجی معاملات میں کیسے مادر پدر آزادی کا خواستگار ہو سکتا ہے؟

الغرض "دورِ جدید" میں بھی فقہ اسلامی کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ جتنی کہ آج سے سینکڑوں برس پہلے تھی، اور زمانی اور مکانی تبدیلیوں نے اس کی "وسعت پذیری" کو ضرور متاثر کیا ہے۔ لیکن اس کی شدید اہمیت میں قطعاً کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

پھر جہاں تک اس کی "وسعت پذیری" کو متاثر کرنے کا تعلق ہے، تو اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ کہ

"فقہ" اپنے اصطلاحی مفہوم میں عقائد، (BELIEVES FAITHS)) عبادات معاملات، عقوبات ((PUNISHMENT) اور سیاسی و انتظامی نظریات (Political and administrative thought) سے عبارت ہے۔ ان میں سے اول الذکر دونوں شعبے، یعنی عقائد و عبادات میں تو زمان و مکان کی تبدیلی سے کسی قسم کی تبدیلی، یا ترمیم و اضافے کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ دونوں شعبے ہر اعتبار سے کامل و مکمل ہیں۔ رہے دیگر شعبے، تو البتہ مرورِ ایام سے ضروریات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اس سے ان میں غور و فکر اور سوچ بچار کی وسیع پیمانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر ضرورت پیدا ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی اثرات کے تحت، قدیم سیاسی اور انتظامی معاملات کا ڈھانچہ بدل گیا ہے، اسی طرح ہمارا جس دور سے واسطہ پڑا ہے۔ اس دور میں اقتصادی معاملات کی یکسر کایا پلٹ ہو چکی ہے اور مالیاتی ڈھانچہ (Economical Structure) مکمل طور پر بدل کر رہ گیا ہے۔

اسی طرح باہمی معاملات خصومات میں بھی نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اور ان کا سلسلہ ابھی جاری ہے! ان جدید مسائل و معاملات کو حل کرنے کی منہاج کیا ہونی چاہیے اور انہیں کس طرح حل کریں۔ زمانۂ حاضر کے چیلنج کا سامنا کیا جائے؟

قریب قریب گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں سے عالمِ اسلام کو ان سوالات کا سامنا ہے، لیکن ابھی تک چھوٹے پیمانے پر، معمولی کوششوں کے سوا، ان مسائل کو حل کرنے کی، عالمی یا ملکی سطح پر کوئی بھی کاوش نہیں ہوئی۔ جس کے نتیجے میں اکثر و بیشتر اسلامی ممالک روز مرّہ کے مسائل میں بدیسی قانون کی پیروی کرتے ہیں۔ جو عالمِ اسلام کا بہت بڑا المیہ ہے۔

۷۔ دورِ جدید میں اجتہاد کو جاری کرنے کی کوششیں

یہاں ان کوششوں کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا، جو گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں عالمِ اسلام میں مختلف صورتوں میں کی گئی ہیں۔

ان کوششوں کو ابتداءً ہم دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: پہلے حصّے میں ان متجددین کی کوششیں ہیں۔ جو "مغربی نظامِ زندگی" سے متأثر ہی نہیں۔ بلکہ اس سے مکمل طور پر مرعوب بھی ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ "مغربی نظامِ زندگی" سے بہتر نظام نہ تو بن سکتا ہے اور نہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کا ہمیشہ سے عالمِ اسلام کو یہی مخلصانہ مشورہ رہا ہے کہ وہ مکمل طور پر مغربی نظامِ زندگی کو اپنا لیں۔ پھر چونکہ اس "تبدیلی" میں ان کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ قرآن و سنّت اور اجماعِ امت کی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ اوّل الذکر یعنی "قرآن مجید" کے سوا کوئی چیز بھی مسلمانوں کے لیے حجّت اور واجب الاتباع نہیں ہے، اس طرح "حدیث" اور "اجماعِ امت" کی حجیّت کو ختم کر کے انہوں نے ایک طرف تو "جدت پرستی" کا بند دروازہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوری طرح چوپٹ کھول دیا اور دوسری جانب " قرآن مجید " کی معانی تشریحات کی راہ میں موجود سب سے بڑی رکاوٹ کو بھی دور کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ آیات قرآنیہ کی اس قسم کی تاویلات کرتے ہیں جو باطنی اور قرامطی تاویلات سے بھی کئی قدم آگے ہیں [1] یہ لوگ عرف عام میں " منکرین حدیث " کہلاتے ہیں اور بزعم خویش خود کو " اہل قرآن " کہتے ہیں ۔ حالانکہ یہ لوگ فقط " اہل قران " باہم ملتے جلتے خیالات والے) تو ہیں ، مگر " اہل قرآن " قطعاً نہیں ہو سکتے ۔

اس تحریک کی ابتدا سر سید احمد خاں مرحوم سے ہوئی اور اسے مختلف لوگوں نے پروان چڑھایا ، جن میں بطور خاص عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز قابل ذکر ہیں ۔

اس گروہ کے بالمقابل دوسرا اقدامت پرست علماء کا گروہ ہے ۔ جن کا خیال یہ ہے کہ اس وقت بھی وہی حالات اور وہی مسائل ہیں ۔ جو آج سے سینکڑوں برس پہلے تھے ، وہ جس ماحول (مدرسہ و خانقاہ) میں رہتے ہیں ۔ اس میں رہتے ہوئے ۔ انھیں واقعی تبدیلی کا احساس نہیں ہو سکتا ، لیکن اگر وہ اپنے ماحول سے باہر نکل کر معاشرے پر ، ایک نظر ڈالیں ، تو انہیں ، خود احساس ہو جائے گا ، کہ زمانہ بہت تیزی سے آگے ہی نہیں ۔ بلکہ ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے ، مسلم نوجوانوں پر اور مسلم قوم پر مذہب کی گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے اور ابنائے وطن بڑی تیزی اور بڑی سرعت کے ساتھ " بدیسی تہذیب " ، ہی نہیں ، بلکہ بدیسی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں ؛ لیکن افسوس صد افسوس کہ وہ اپنے ماحول سے باہر نکل کر معاشرے کو دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں ملک کے ایک نامور شیخ الحدیث کی خدمت میں یہ درخواست لے کر حاضر ہوا ، کہ فلاں اخبار میں جو ایک صاحب ہمارے اسلاف کے خلاف مسلسل زہر افشانی کر رہے ہیں ، آپ اس کے خلاف کوئی بیان دیں ۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ " میں تو اخبار پڑھتا ہی نہیں کرتا " ! تو جب ایک اعلیٰ پائے کے استاذ الاساتذہ کا یہ حال ہو ۔ کہ وہ اخبار جیسی روزمرہ ضرورت اور معلومات عامہ کی چیز کو بھی ، اس بنا پر ہاتھ نہ لگائے ۔ کہ اس میں تصاویر ہوتی ہیں ، تو اس سے ان کے دور حاضر

---

[1] مثال کے طور پر دیکھئے غلام احمد پرویز : مفہوم القرآن ؛ اسی طرح دیگر منکرین حدیث کی کتب ، جنہوں نے معانی قرآن کا ایسا بھونڈا تصور پیش کیا ہے جو اسلام کے بجائے کفر کے زیادہ قریب ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مسائل سے متعلق مبلغِ علم کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، میں یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ اس سے میری مراد مقتدر علمائے کرام کی تحقیر قطعاً نہیں ۔ میرا مقصد تو فقط یہ جتلانا ہے کہ یہ حضرات جن کے کندھوں پر قوم و ملک کی قیادت کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ وہ ملک و قوم کے حالات و مسائل کا ادراک کیے بغیر قیادت کی ذمہ داریاں قطعاً انجام نہیں دے سکتے ۔ انہیں اگر ملک و قوم کی صحیح مذہبی قیادت فراہم کرنا ہے اور ملت کو دوبارہ اسلام کے جھنڈے تلے لانا ہے، تو انہیں اپنے رویے میں تبدیلی کرنا ہوگی اور حالات و مسائل کا بے لاگ تجزیہ کر کے موجودہ مسائل کا اسلامی حل پیش کرنا ہوگا ۔

قوم کے ان مقتدر علمائے کرام کے خانہ نشین ہو جانے سے قوم و ملت کی قیادت کا میدان طالع آزماؤں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے ۔ جس میں مختلف شعبدہ باز مذہب کے نام پر، لوگوں کو بیوقوف بنانے میں مصروف نظر آتے ہیں ۔

پھر جب تک یہ حضرات اپنے فروعی نزاعات کو ختم کر کے، ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے اور اس کے قریب تر کرنے کی زحمت نہ کریں گے ۔ اس وقت تک وہ "قوم و ملت" کی رہنمائی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے ۔ اور یہ کام "براہیمی نظر" پیدا کئے بغیر کرنے انجام دینا ممکن نہیں ۔

بقول شاعر مشرق :

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اجتہاد کی ترویج کے لیے ممکنہ کاوشیں

بایں ہمہ یہاں یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ راسخ العقیدہ علمائے کرام کی جانب سے اس محاذ پر مکمل طور پر خاموشی یا سکوت ہے، اس لیے کہ ہمیں اس وادی پرخار میں ایسے جفاکش اور سخت کوش علمائے کرام کے نقش پا بھی ملتے ہیں ۔ جن کے طریقے کو بعد میں جاری نہ رکھا جا سکا ۔

ہندوستان میں اس بابرکت سلسلے کا آغاز و احیا دہلی کے مرد مجاہد امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مجاہدانہ کاوشوں کا رہین منت ہے، انہوں نے بالخصوص ہندوستان میں صدیوں کے جمود و تقشف کو توڑا اور امت کو باصرار اجتہاد کی طرف توجہ دلائی، انہوں نے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والتقلید" لکھ کر خصوصی طور پر امت کو اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کی جانب متوجہ کیا اور اسے "امت" پر ایک "فرض کفایہ" قرار دیا۔ اسی طرح انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں بھی مختلف عناوین کے تحت اس موضوع پر روشنی ڈالی اور "اجتہاد" کی اہمیت کو واضح فرمایا۔ امام العصر اٹھارھویں باب میں دین میں تحریف کے اسباب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"من جملہ اسباب تحریف کے غیر معصوم ہستی کی تقلید کرنا ہے۔ غیر معصوم ہونے سے میری مراد ایسا شخص ہے جو نبی نہ ہو جس کی عصمت ثابت ہو چکی ہے۔ تقلید کی حیثیت یہ ہے کہ امت کا ایک عالم مجتہد اجتہاد کر کے کوئی مسئلہ بتاتا ہے تو اس کے متبعین اس کو اس حد تک سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے خلاف اگر کوئی صحیح حدیث بھی پیش کی جائے، تو امام کے قول کی خاطر ان کے لیے اس حدیث کا رد کر دینا نہایت آسان ہوتا ہے۔ جس کی تقلید کو علمائے امت نے جائز قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی جاہل اور بے علم ہونے کی بنا پر کسی عالم مجتہد کے قول کا اتباع کرے۔ لیکن ساتھ ہی اس کا یہ مستحکم عقیدہ ہو، کہ وہ ایک غیر معصوم انسان ہے اور اس لیے اس کا قول غلط بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ علماء کا یہ متفق علیہ قول ہے، کہ مجتہد کا قول کبھی غلط بھی ہوتا ہے اور کبھی درست بھی۔ ایسے مقلد کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہے کہ اگر کسی مسئلے میں اس کو اپنے امام کے قول کے برخلاف کوئی بات مل جائے تو وہ فوراً اس کو ترک کر کے حدیث کا اتباع کرے گا [۱]

اسی طرح شاہ صاحب تقلید کی قباحتوں پر بحث کرتے ہوئے، تتمہ کے باب چہارم میں تحریر فرماتے ہیں :

"اس طبقہ کے بعد جو نسلیں ظہور میں آئیں، انہوں نے خالص تقلید کے عقیدہ پر نشو و نما پائی نہ تو وہ حق اور باطل میں تمیز کر سکتے ہیں اور نہ ہی وہ جدل و استنباط کو ایک دوسرے سے علیحدہ سمجھتے ہیں ..... الغرض مذکورہ بالا طبقہ متعمقین (تعمق پسند

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ : ۱ : ۵۸۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(Extreemists) کے بعد جمود طبقہ بھی ظہور میں آیا، وہ پہلوں کی نسبت جمود اور تقلید کا زیادہ دلدادہ ثابت ہوا، اور دن بدن لوگوں کے دلوں سے امانت اٹھتی چلی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے دینی مسائل میں خوض کرنا ہی چھوڑ دیا اور یہ قول جو قرآن مجید میں کافروں کی زبان سے نقل کیا گیا ہے، ان کا وردِ زبان رہتا ہے: [اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ (بیشک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک ہی شاہراہ پر چلتے ہوئے پایا اور یقیناً ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے)، اس کی شکایت کس سے کریں [۱]

اس سے اگلے باب میں، جہاں آپ نے اجتہاد اور تقلید کی حیثیت پر بحث کی ہے، وہاں آپ نے یہ لکھا ہے۔کہ:

"ان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں، انہوں نے مختصر طور پر احکام بیان کرنا شروع کیا (مثلاً یہ کہہ دیتے ہیں۔کہ فلاں بات کو اس طرح کرنا چاہیے۔یا اس طرح نہیں کرنا چاہیے) جس سے ان کے ائمہ کا قولِ مختار ایسا نظر آنے لگا، گویا ان کے نزدیک بس شرع کا یہی حکم ہے، مخالف کے قول کو وہ باطل سمجھتے ہیں (چنانچہ درِّ مختار وغیرہ کتب فقہ حنفیہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔کہ "اگر تم سے مذہب کی بابت پوچھا جائے، تو تمہارا قطعی اور دوٹوک جواب یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا مذہب برحق ہے، غلط ہونے کا اس میں احتمال پایا جاتا ہے دوسرے مجتہدین کا مذہب باطل ہے اور اس میں صحیح ہونے کا احتمال ہے [۲]۔)

ان تصریحات سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب متأخرین میں اجتہاد کے جاری نہ رہنے سے اور اجتہادی مسائل میں جمود و تقشف پیدا ہو جانے سے کس قدر نالاں تھے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہر مسلک کے لوگوں کو فروعی اور اجتہادی مسائل میں ایک دوسرے کا نقطۂ نظر بھی سننا چاہیے اور اگر دوسرا کوئی مسلک برسرِ حق ہو، یا اس کے پاس وزنی دلیل موجود ہو، تو اس کے تسلیم کرنے میں تاخیر

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ، ۱: ۱۹۰

[۲] ایضاً، ص ۲۰۶ - ۲۰۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کرنی چاہیے :

اپنے اس مسلک کے مطابق انہوں نے چند مسائل میں اپنا منفرد اسلوب اختیار فرمایا تھا، (اس کی تفصیل کے لیے حجۃ اللہ البالغہ، تتمہ کا آخری باب ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، جہاں انہوں نے احناف کے ہاں کئی مسلّمہ اصولوں اور ان کی فروع پر بحث کی ہے) جس کی اس زمانے میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ الموطا کی عربی اور فارسی شروح بھی دیکھی جاسکتی ہیں، جو المسوّیٰ اور المصفّا کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

ان کے اس اسلوب فکر کو ان کے خاندانی بزرگوں اور ان کے بعض مقتدر شاگردوں نے بھی اپنایا اور یوں ہندوستان میں پہلی مرتبہ حنفی فقہا میں اجتہادی کوششوں کی ابتدا ہوئی۔

خاندانی بزرگوں میں ان کے فرزند و جانشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء تا ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) اور شاہ اسماعیل شہیدؒ (۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء تا ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے شاہ صاحب کے اس انداز فکر کو اپنایا۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے تو خاص طور پر رفع یدین کے اثبات میں دو کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان میں سے ایک کا نام "تنویر العینین فی اثبات رفع یدین" ہے اور دوسری کتاب "تنقید الجواب در اثبات رفع الیدین" ہے۔ تاہم رفع یدین کے علاوہ اکثر مسائل میں ان کا مسلک حنفی ہی تھا۔ ان بزرگوں کے علاوہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید دہلوی (م ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) اور علامہ محمد فاخر الہ آبادی نے بھی بعض مسائل میں اجتہادی اسلوب اپنایا تھا۔ ان کے شاگردوں میں سے خصوصی طور پر بیہقی وقت قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے استادِ محترم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے اس موضوع پر خصوصی تربیت حاصل کی اور اس نہج سے احکام و مسائل کے پورے ذخیرے پر گہری نظر ڈالی۔

متاخرین کے زمانے میں وہ بلاشبہ ایک نابغہ شخصیت تھے۔ ہمیں اس پورے دور میں ان جیسی علم و فضل والی شخصیت نظر نہیں آتی۔ انہوں نے اس عنوان پر مشتمل کتب تصنیف کرنے کے علاوہ تفسیر مظہری میں بہت مبسوط اور مدلّل بحثیں کی ہیں انہوں نے قرآن مجید کی آیت :

وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ [1]

---

[1] سورہ آل عمران : ۶۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تفسیر میں مدلل بحث کرتے ہوئے تحریر کیا ہے ۔ کہ :
" عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ جب آیت : اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ [1] (انہوں نے اپنے احبار و رھبان کو ۔ خدا کو چھوڑ کر ۔ معبود بنالیا ہے) نازل ہوئی تو میں نے خدمت نبوی میں عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ! ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے ! اس پر آنحضورؐ نے فرمایا ، کہ کیا وہ تمہارے لیے جس کو چاہتے حلال اور جس کو چاہتے حرام نہ کرتے تھے ، اور تم ان کی بات کو تسلیم کرتے تھے ، عدی نے کہا کہ یہ بات تو درست ہے ۔ (الترمذی) ۔ لہٰذا اگر تو رسول کی اطاعت ہو ، تو وہ اللہ ہی کی اطاعت ہے ، کسی اور کی نہیں ۔ قرآن مجید میں ہے : مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [2] (جس نے رسول کی اطاعت کی ، اس نے اللہ کی اطاعت کی) ، اسی طرح اگر علمائے کرام ، اولیائے عظام اور سلاطین و حکام کی اطاعت شریعت کے تقاضوں کے مطابق کی جائے ، تو اس کا بھی یہی حکم ہے ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ [3] (اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی اور تم میں سے جو صاحب معاملہ (حکومت) ہیں ، ان کی) لیکن اگر ان کی اطاعت شریعت کے احکام کے خلاف کی جائے ۔ تو یہی انھیں اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنانا ہے ، حضرت علیؓ سے مروی ہے ۔ کہ " اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی اور کی اطاعت جائز نہیں ، اطاعت تو فقط نیک کاموں میں ہونی چاہیے ، یہ روایت بخاری و مسلم ، ابوداؤد ، النسائی وغیرہ میں مذکور ہے ۔ اسی طرح عمران بن حصین اور حکیم بن عمرو الغفاری روایت کرتے ہیں ۔ کہ خالق کے معاملے میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے ۔

---

[1] التوبہ : ۳۱

[2] النساء : ۸۰

[3] ایضاً : ۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب کسی کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی ایسی مرفوع حدیث ثابت ہو جائے، جو معارضہ سے محفوظ ہو اور جس کا ناسخ حکم بھی نہ پایا جائے، اور مثال کے طور پر امام ابوحنیفہؒ کا دعویٰ اس کے خلاف ہو۔ اور اس حدیث کے مطابق ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک نے عمل کیا ہو، تو اس شخص پر اس ثابت شدہ حدیث کی اتباع ضروری ہوگی، اور اس کے مسلک پر اس کا جمود اسے مانع نہ ہونا چاہیے، تاکہ ہمارا ایک دوسرے کو، خدا کو چھوڑ کر معبود بنانا لازم نہ آئے۔ البیہقی نے اپنی کتاب المدخل میں عبداللہ بن المبارک تک صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے، کہ وہ فرماتے ہیں:

"میں نے امام ابوحنیفہؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ملے۔ تو وہ میرے سر آنکھوں پر اور اگر صحابہ کرامؓ سے کوئی قول مروی ہو، تو ہم ان میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دیں گے اور اگر تابعین سے کوئی قول مذکور ہو، تو ہم اس کی مزاحمت کریں گے۔"

اور روضۃ العلماء میں مروی ہے۔ کہ امام صاحب نے فرمایا: کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور صحابی کے قول کے مقابلے میں میری رائے کو چھوڑ دو۔"

دوسری روایت میں ہے۔ کہ جب کوئی صحیح حدیث مل جائے، تو وہی میرا مسلک ہے۔

اور یہ جو میں نے کہا کہ اس پر ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک نے عمل کیا ہو، تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس سے خلاف اجماع عمل کرنا لازم نہ آئے، اس لیے کہ ابتدائی تین یا چار صدیوں کے بعد اہلسنت چار مسالک میں بٹ گئے اور ان چار مسالک کے علاوہ فقہی مسائل میں کوئی اور مسلک نہ رہا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی معاملے میں ائمۂ اربعہ کے قول کی خلاف ورزی کرے، تو اس کے قول کا اجماع کے خلاف ہونا لازم آتا ہے، حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ "کبھی بھی میری امت ضلالت وگمراہی پر جمع نہ ہوگی"۔ نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَن يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا[1] اور جو شخص مسلمانوں کے طریقے کو چھوڑ کر

---

[1] النساء: ۱۱۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی اور طریقہ اپنائے گا، ہم اس کو ادھر ہی پھیر دیں گے، جدھر وہ پھرنا چاہتا ہے اور ہم اس کو داخل کریں گے جہنم میں ۔ جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے)؛ نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ حدیث ائمۂ اربعہ اور اکابر علماء سے آج تک مخفی رہی ہو، لہٰذا اس حدیث کے بارے میں، اس کے منسوخ یا مؤوّل ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے[۱]"

ان کے نزدیک ہر شہر میں مجتہد کے درجے پر فائز کم از کم ایک مفتی کا ہونا ضروری تھا، جو لوگوں کی مختلف مسائل و معاملات میں رہنمائی کر سکے؛ سورۃ التوبہ کی ایک آیت کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں:

"اور یہ بات فرض کفایہ ہے کہ شہر شہر میں کوئی ایک شخص علم کا ہر باب سیکھے، تا آنکہ وہ فتویٰ دینے کے درجے کو پہنچ جائے، پس اس صورت میں اگر شہر کے باقی لوگ علم سیکھنے سے محروم رہ جائیں تو اُس مفتی کے شہر میں ہونے کے باعث وہ گناہ میں گرفتار ہونے سے محفوظ رہیں گے ... اور ان تمام لوگوں کو اپنے پیش آئندہ مسائل میں اس کی اتباع کرنا ہوگی[۲]"

قاضی صاحب کے یہ رہنما اصول یقینی طور پر اپنے استاد و مربی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے فیضانِ تربیت کے عکّاس ہیں۔ اور ان کے اُس مجتہدانہ اسلوب فکر کے غمّاز ہیں، جو انہیں ہندوستان کی علمی و فقہی تاریخ میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

راقم الحروف نے قاضی صاحب پر اپنے تحقیقی مقالے میں، قاضی صاحب کے مجتہدانہ اسلوب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے، ان کی تفسیر سے۔ ان کے بلند پایہ اجتہاد کی بھی بہت سی مثالیں بھی ذکر کی ہیں۔ جس کی تفصیل بیان کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ سرسری طور پر چند اشارات کرنا مناسب ہوگا۔

عام طور پر ماہرینِ اصول فقہ نے مجتہدین کی کئی اقسام بیان کی ہیں، جن میں مجتہد مطلق (بانیان مسالک اربعہ)، مجتہد منتسب (ائمۂ اربعہ کے قریبی شاگرد وغیرہ)، مجتہد فی المذہب (جو عمومی مسائل میں اپنے امام کا مقلد ہو، مگر کوئی نیا واقعہ پیش آنے پر آزادانہ اجتہاد کرتا ہو)، اور مجتہد فی الفتویٰ

---

[۱] تفسیر مظہری، ۱۰۲ : ۶۳ - ۶۴۔
[۲] ایضاً ، ۴ : ۳۲۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ائمۂ کرام کے اقوال کو باہم ترجیح دینے کی صلاحیت رکھنے والا) وغیرہ شامل ہیں۔ قاضی صاحب کے فتویٰ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بیک وقت مجتہد فی الفتویٰ بھی تھے اور مجتہد فی المذہب بھی۔ اول الذکر حیثیت سے جہاں انہوں نے اپنے ائمہ کے اقوال کو باہم ترجیح دی وہاں مجتہد فی المذہب کی حیثیت سے بعض مسائل میں اپنے ائمہ کے وضع کردہ اصول و قواعد کے تحت آزادانہ اجتہاد کا حق بھی استعمال کیا اور مختلف مسائل میں اپنی بالغ فکر سے امت کی راہنمائی فرمائی۔

انہوں نے متعدد مسائل میں اپنے امام کی رائے کے بجائے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی رائے کو بھی راجح قرار دیا ہے۔ اور جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالے میں صراحت کی ہے کہ اگر اسی انداز فکر کو دیگر اہل مسالک کی طرف سے بھی اپنایا جاتا، تو دنیائے اسلام یقینی طور پر ایک ایسی فقہ تک پہنچ جاتی، جس میں اپنے اپنے مسالک کی حدود میں پابند رہنے کی بجائے، ایک وسیع تر بین الاقوامی (INTERNATIONAL) اسلامی فقہ کی تصنیف و تدوین ممکن ہو جاتی، مگر افسوس کہ قاضی صاحب مرحوم کے اس اسلوب فکر کو نہ تو دوسرے اہل مسالک نے اپنایا اور نہ ہی ان کے بعد۔ اس طریقے کو جاری رکھا جا سکا۔

"ہندوستان" میں اہل حدیث حضرات نے بھی "اجتہاد" کو اپنانے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے کی کاوشیں کی ہیں، لیکن ان کی یہ کاوشیں بھی بالآخر ایک خاص مسلک اور نقطۂ نظر تک محدود ہو کر رہ گئیں اور اجتہاد و قیاس کے اصول و قواعد اور دیگر مجتہدین کی کتب سے کم علمی اور کسی قدر تعصب کی بنا پر، ان کا بھی ایک خاص حلقہ یا مسلک بن گیا ہے۔ جو نسلاً بعد نسلٍ آگے متوارث ہو رہا ہے اور "تقلید" کی شد و مد سے تردید بلکہ خدمت کے باوجود، وہ خود بھی عملاً مقلد ہو کر رہ گئے ہیں۔

علامہ اقبال اور اجتہاد

برعظیم پاک و ہند میں فقہ اور مسائل فقہ کی "تدوین نو" کے ضمن میں علامہ اقبال کی مساعی جمیلہ کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں جب برعظیم پاک و ہند کے مسلمان آزادی اور حصول وطن کی جنگ جیتنے میں مصروف تھے، انہیں مسائل فقہ میں اجتہاد کے ذریعے عصری تقاضوں کا چیلنج قبول کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے مشرق و مغرب کے دونوں معاشروں کو گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ اس لیے جتنی بالغ نظری سے وہ اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کر سکتے تھے، کسی اور کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے انہی تاثرات کے تحت اپنے خطبے The principle of movement in the structure of Islam. میں انہوں نے اسلامی قانون کے ماخذ اربعہ (قرآن، حدیث، اجماع و قیاس) کے تجزیے کے ساتھ ساتھ ترکی اور مصر میں تجدید و تحریر قانون اسلامی کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جدید تشکیل فقہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن یہ ضرورت جدید حالات و کوائف کے ساتھ محض مطابقت پیدا کرنے کی نہیں۔ بلکہ مغرب کے ناروا اور انسانیت دشمن نظریات و تجربات کی تردید کرتے ہوئے مثبت اقدار اخلاق و زندگی پر مبنی ایک نیا قانون بنا کر پوری کی جا سکتی ہے۔ یہ قانون قرآن و سنہ کے نصوص سے ماخوذ ہونے کے ساتھ ساتھ جدید انکشافات سے صرف نظر نہ کرے۔ اور اس کی مدد سے کائنات کی روحانی تشریح فرد کی اخلاقی آزادی و نجات اور عالمگیر معاشرے کی مثبت اساس معیّن کی جائے۔

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کی کتاب اقبال اور اجتہاد:

علامہ اقبال کے مذکورہ خطبے پر موافق و مخالف دونوں طرح کی کافی بحث ہو چکی ہے۔ یہاں ہم اس سلسلے کی معروف کتاب کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ کتاب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ نے علامہ اقبال کے تصوّر اجتہاد پر تحریر کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب بھی ان کی شخصیت کی طرح متنازعہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں موصوف مکتب اہلحدیث سے تعلق رکھنے کی بنا پر حنفی مکتب فکر بالخصوص امام ابویوسف و امام محمدؒ کے ساتھ فطری عناد رکھتے ہیں۔ دور حاضر میں امام ابویوسفؒ کی ذات پر جتنا کیچڑ انہوں نے اچھالا ہے اور ان کی ذات اور ان کے کارناموں پر جس بھونڈے اور غلط انداز میں تبصرے کیے ہیں، وہ شاید گذشتہ تیرہ صدیوں کے مخالفانہ تبصروں پر بھاری ہوں گے۔ ان کے ہر مضمون میں امام ابویوسفؒ کا اور ان کی ملوک پرستی کا بالالتزام ذکر ہوتا ہے۔ خواہ مضمون کا موضوع کچھ ہی ہو۔ اس طرح ایک عام قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو "ابویوسف فوبیا" ہو گیا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی قریب قریب ہر تحریر اور ہر تقریر میں امام ابویوسفؒ پر کیچڑ اچھالنے کا لازماً التزام ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن موصوف کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں کے باوجود نہ تو امام ابو یوسفؒ کی قدر و منزلت میں کمی ہوئی ہے اور نہ ہی اس سے حنفی فقہ کی عالمگیریت پر کوئی حرف آیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں "ابو یوسف فوبیا" بھرپور طریقے سے نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں مصنف سے بالخصوص حنفی فقہ کے متعلق انصاف کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

پھر۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب کی اساس علامہ اقبال کا مشہور خطبہ ہے جس میں علامہ مرحوم نے دورِ جدید میں اجتہاد کے جاری رکھنے کی اہمیت و ضرورت کو واضح کرتے ہوئے اس کے اجرا کے لیے بعض تجاویز پیش کی ہیں۔

علامہ اقبال ۔ اپنے تمام تر احترام و اکرام کے باوجود ۔ نہ تو معصوم عن الخطا رہتے اور نہ ہی "فقہ اور اصول فقہ" میں بہت بڑا ادراک رکھتے تھے۔ موصوف کی قدر و منزلت کے باوجود ان کی آرا مسلمانوں کے لیے واجب الاتباع نہیں ہیں۔ خود علامہ مرحوم کو بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ یہ تو بعض متجددین ہیں، جو ایک طرف تو انبیا تک کو معصوم عن الخطا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دوسری جانب علامہ مرحوم کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ گویا ان کی ہر بات خطا و نسیان سے منزّہ اور مبرا رہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے:

بریں عقل و دانش بباید گریست

پھر دورِ حاضر تو تخصیص (SPECIALIZATION) کا دور ہے۔ ہر شعبے میں فقط اسی کی رائے کو قبول کیا جاتا ہے، جس نے اس شعبے میں خصوصی مہارت بہم پہنچائی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ڈاکٹر (معالج) کی بات انجینئرنگ میں اور ماہر سے ماہر انجینئر کی بات میڈیکل میں قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اور علامہ اقبال کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ بہت بڑے فلسفی، شاعر، سیاست داں اور ماہر قانون تھے، لیکن اسلامی فقہ اور مسائل فقہ میں انہیں ایسا تبحر حاصل تھا اور نہ ہی انہیں اس بات کا دعویٰ تھا۔

پھر علامہ مرحوم کے خیالات میں ہمیں واضح طور پر ایک ترقی اور تدریج نظر آتی ہے۔ ان کے عقائد و خیالات میں پختگی آخری زمانے میں پیدا ہوئی وہ ابتدائی دور میں معدوم نظر آتی ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علامہ مرحوم نے آخری زمانے میں مذکورہ خطبے میں مذکور خیالات سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے رجوع کر لیا تھا۔ اس پس منظر میں اس خطبے کی وہ اہمیت نہیں رہ جاتی۔ جو مصنف پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر گورایہ صاحب کی پوری کتاب یوں تو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، مگر اس میں انہوں نے تقریظات کو بھی شامل کتاب کر کے بلاوجہ اس کی ضخامت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے، اس پوری کتاب کا ملخص ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

"اسلامی ریاست کی منتخب مقننہ کا بنیادی فریضہ تعبیر شریعت ہے، اس وقت یہی سب سے اہم مسئلہ قوم کو درپیش ہے کہ شریعت کی تعبیر کا اختیار کس کو حاصل ہے۔ کیا فقہی مسلکوں کے غیر منتخب افراد اس کا حق رکھتے ہیں یا تعبیر شریعت کا اختیار منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے۔ تعبیر شریعت کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے آئیے اس سوال پر علامہ اقبال کے افکار سے رہنمائی حاصل کریں۔"[1]

ڈاکٹر گورایہ کے ان فرمودات میں کئی امور غور طلب ہیں: اول تو انہوں نے تعبیر شریعت کے متعلق منتخب اور غیر منتخب کی جو تفریق کی ہے، وہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس لیے کہ اجتہاد یا تعبیر شریعت کا کسی صورت میں بھی انتخاب یا عدم انتخاب سے تعلق نہیں ہے! اگر اسی بات کو مدار ٹھہرایا جائے، تو بات بہت دور نکل جاتی ہے۔ اس لیے کہ ان معنوں میں نہ تو خلفائے راشدین کا انتخاب ہوا تھا اور نہ ہی۔ ان کی مجالس شوریٰ عوام الناس میں سے منتخب تھیں۔ اسی طرح تمام ائمہ کرام بھی کسی منتخب اسمبلی یا ایوان کے رکن نہ تھے، اس لیے یہ بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ پھر انہوں نے جس طرح تفریق کیے بغیر اسمبلی کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات تعبیر شریعت کے نام سے دیئے ہیں، اس سے دولت، دھونس اور برادریوں کی بنیاد پر منتخب ہونے والے لوگوں کو لامحدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ جس کو استعمال کرنے سے ملک میں قانون شریعت کے بجائے کسی اور قانون کا ہی بول بالا ہو سکتا ہے، اس لیے ان کے ان خیالات سے کوئی بھی صاحب فہم و فراست شخص اتفاق نہیں کر سکتا۔ مزید برآں ان کے یہ خیالات نظام میں خرابی اور فساد پیدا کرنے کا باعث بنیں گے ــــــ لہٰذا اس کے بجائے ایک درمیانی راہ اختیار کرنا مناسب ہوگا جس پر ہم

---

[1] اقبال اور اجتہاد، ص ۱۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئندہ اوراق میں بحث کریں گے۔

ترکی مصری اور عربی علما کی کاوشیں

چونکہ مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا پہلا تصادم "ترکی" اور عرب ممالک بالخصوص مصر میں ہوا اور انہی خطوں میں سب سے پہلے نئے مسائل نے سر اٹھایا، اسی لیے قدرتی طور پر ان ممالک میں ان مسائل کے حل کی کوششیں بھی پہلے شروع ہوئیں۔

اس کا آغاز ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں اسوقت ہوا، جب سلطنت عثمانیہ کے ناظم محکمہ عدلیہ (احمد جودت پاشا) کی سربراہی میں قائم شدہ ایک مجلس نے "متفقہ مدنی قانون" کا خاکہ پیش کیا جو بعد ازاں "مجلۃ الاحکام العدلیہ" کے نام سے ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء میں سرکاری طور پر شائع ہو کر تکمیل پذیر ہوا۔ اس میں کل ۱۸۵۱ دفعات ہیں اور اس میں عبادات اور عقوبات (سزائیں) شامل نہیں ہیں۔ صرف تمدنی زندگی کے متعلق احکام ہیں اور ان میں توثیق کے بجائے ترمیمات زیادہ ہیں۔ ان کے اکثر احکام و مسائل حنفی کتب فقہ سے ماخوذ ہیں البتہ جہاں امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین کے مابین اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ وہاں انہوں نے فیصلہ مصلحت عامہ کے تحت کیا ہے۔

اس کے بعد نامور مصری عالم قدری پاشا نے فقہ حنفی پر مبنی ایک مجموعہ تیار کیا، انہیں یہ کام حکومت مصر نے سپرد کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نکاح، طلاق، اولاد، نابالغ کی سرپرستی، ہبہ اور وصیت وغیرہ پر مشتمل ایک مسودہ قانون مرتب کیا جس میں ۶۴۷ دفعات تھیں ان کی یہ کتاب مصر اور دیگر عرب ممالک میں مستند قرار پائی اور اسے مصری عدالتوں میں نافذ کر دیا گیا۔

مصری عدالتوں میں از روئے ضابطہ تنظیم عدالت ہائے شرعیہ مجریہ ۱۸۸۰ء کی دفعہ ۲۸۰ کی رُو سے فقط امام ابو حنیفہؒ کے مفتی بہ اقوال پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ مگر بعد میں قانون نمبر ۲۵ مجریہ ۱۹۲۰ء کی رُو سے نان و نفقہ، عدت اور گم شدہ جیسے مسائل میں امام مالک اور امام شافعیؒ کے اقوال پر بھی عملدرآمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی طرح ۱۲ راگست ۱۹۴۳ء کو مصری حکومت نے اسلام کے قانون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میراث کو نافذ کرنے کا نوٹیفیکشن جاری کیا، جس کی رُو سے چار ماہ بعد اس کا نفاذ کیا گیا تھا، اس قانون کل ۴۰ دفعات ہیں[1]

مصر میں جدّت پرستوں اور آزادی پسندوں کے ساتھ ساتھ قدامت پرست علما بھی برابر اپنی کوششوں میں مصروف رہے۔ ان دونوں کے حسنِ امتزاج سے انیسویں صدی میں ایک زبردست اصلاحی تحریک اٹھی، جس کی قیادت نامور عالم دین سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء - ۱۸۹۷ء) اور ان کے نامور شاگرد شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۹ء - ۱۹۰۵ء) مفتی مصر کے ہاتھ میں تھی۔ اس تحریک کے زعما نے اپنی کتابوں، تحریروں اور تقریروں میں اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کو اس حقیقی شریعت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جس کا ذکر قرآن و سنہ میں ملتا ہے۔ یہ حضرات اجتہاد کو جاری رکھنے کے زبردست اور پرجوش حامی تھے اور اس جمود کو پسند نہیں کرتے تھے، جو گذشتہ کئی صدیوں سے عالم اسلام پر چھایا ہوا ہے۔ انہی خطوط پر یہ لوگ چاہتے کہ مختلف اہل مسالک کو باہم دگر متحد کیا جائے، اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ کوئی ایک فرقہ ایک مذہب کے مقلّدین کی تقلید کا بار برداشت نہیں کر سکتا، اور نہ ہی وہ اپنے امور خانگی اور مالی معاملات کی فلاح و بہبود کو ہر حالت میں صرف ایک مذہب کی کتابوں سے وابستہ کرنا پسند کرے گا۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ صرف اسی طرح شریعت اسلامی عصر جدید کے دوش بدوش چل سکتی ہے۔

چنانچہ وہ بہت سے معاملات تجارت میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، کیونکہ جب عقل اور نقل کا اختلاف ہو جائے، "تو عقلی فیصلے پر عمل کیا جائے گا" یہ اصول شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے اس اصول کے مطابق ہے کہ شریعت اسلامی کی صحیح روایت ہمیشہ عقلی فیصلے کے مطابق ہوتی ہے[2]

اس تحریک کا اثر یہ نکلا، کہ شیخ الازہر علامہ محمد مصطفیٰ المراغی (م ۱۹۴۵ء) سا بلند پایہ عالم، اس کا ترجمان بن گیا، اور انہوں نے قانون سازی، درس و تدریس اور صحافت کی دنیا میں نمایاں مقام پیدا کیا۔

---

[1] صبحی المحمصانی: شریعت اسلام، ۱۰۹ - ۱۱۲۔

[2] کتاب الاسلام والنصرانیہ مع العلم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیخ الازہر نے علمائے ازہر کی ایک جماعت کو اپنا نمائندہ اور ترجمان بنا کر اس بین الاقوامی کانفرنس میں بھیجا جو قانون مقارن (Comparative law) یعنی قانون کے تقابلی مطالعہ و تحقیق کے لیے اگست ۱۹۳۷ء کو بمقام ہاگ (THE HAGUE) منعقد ہوئی تھی چنانچہ اس جماعت نے انسانی مسئولیت کی تشریح شریعت اسلامیہ کے مطابق کی اور ثابت کیا کہ شریعت اسلامیہ ایک مستقل قانون ہے۔ جو قطعاً رومی قانون سے متاثر نہیں ہوا اور جو بدلتے ہوئے عصر جدید کے حالات کے لیے بھی سازگار ہے،

آخر میں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا کہ ملک مصر احکام شرعیہ کی جدید تدوین میں ہمیشہ حنفی مسلک کا پابند نہیں رہا۔ بلکہ وہ اس اصلاحی تحریک سے پوری طرح متأثر ہوا ہے۔ جس کا سطور بالا میں ذکر آچکا ہے۔ چنانچہ میراث کا جدید قانون اگرچہ قدری پاشا کی کتاب پر مبنی ہے مگر بعض مسائل میں اس سے مختلف بھی ہے۔ مثال کے طور پر جدید قانون نے اس مسئلے میں شافعی فقہ کی موافقت کی ہے کہ اختلاف وطن حتیٰ کہ غیر مسلموں کے لیے بھی میراث سے مانع نہ ہوگا۔ اسی طرح ۱۹۴۶ء کا جاری کردہ قانون وقف بھی حنفی مسلک سے مختلف ہے۔ مثلاً اس میں واقف کو اپنے وقف سے رجوع کرنے اور وقف کو موقت بنانے کا حق دیا گیا ہے۔ اسی طرح غیر وارث کے لیے وقف کے نصاب کو ایک ثلث تک محدود کر دیا گیا ہے۔

مصر میں قوانین میں تبدیلی و ترمیم کے لیے پارلیمنٹ کے بجائے، اس مقصد کے لیے مستقل طور پر قائم کردہ کمیٹیوں سے کام لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مدنی (CIVIL) قانون کی تنقیح کے لیے پہلی کمیٹی ۱۹۳۶ء میں دوسری ۱۹۳۸ء میں اور تیسری بھی ۱۹۳۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری بیگ کی زیر قیادت بنائی گئی۔ آخری کمیٹی نے تقریباً دو سال کے عرصے میں اپنا کام قلمبند کیا۔ اور اس کے بعد توضیحی اور ٹھوس یادداشتیں قلم بند کیں لہ

۹۔ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور اجتہاد

ہمارے ملک میں خصوصاً اور دیگر اسلامی ممالک میں عموماً عرصہ دراز سے جو سوال زیر بحث ہے

لہ المحمصانی، فلسفۃ التشریع الاسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور موجودہ حالات کے تناظر میں سب سے اہم ترین مسئلہ (BURNING QUESTION) کہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ پورے ملک کے لیے قابل قبول فقہ (قانون) تیار کرنے میں، اسلامی نقطۂ نگاہ سے مجلس شوریٰ" (PARLIAMENT) کا کیا کردار ہے اور یہ کہ آیا اسے اجتہاد کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

اس ایک سوال میں درحقیقت دو سوال پوشیدہ ہیں:

ا: اجتہاد کی اہلیت کا معیار کیا ہے۔

ب: بطور مقننہ مجلس شوریٰ (قومی اسمبلی اور سینیٹ) کس طرح اپنا قومی اور ملکی کردار ادا کر سکتی ہے؟

ہم ان دونوں سوالوں پر الگ الگ گفتگو کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

ا۔ اجتہاد کی اہلیت کا معیار

اجتہاد کے ضمن میں پہلی لازمی شرط مجتہد میں مطلوبہ اہلیت اور صلاحیت کی موجودگی ہے، اسی لیے اگر کسی مسئلے کا قیاس کسی نااہل شخص نے کیا ہو اور اس نے مطلوبہ شرائط پوری نہ کی ہوں تو اس کا اجتہاد بجائے شرعی ہونے کے غیر شرعی ہوگا اور فائدہ مند ہونے کے برعکس نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اسی لیے قریباً قریباً اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر لکھنے والے تمام مقتدر علماء نے اس کی اہلیت و غیر اہلیت کے مسئلے پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔ امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" میں اجتہاد کی اہلیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

وشروطه انه لابد له ان يعرف من الكتاب والسنة وما يتعلق بالاحكام ومواقع الاجماع وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة[1]

ترجمہ: اجتہاد کی شرائط یہ ہیں۔ کہ وہ (مجتہد) قرآن وسنت اور احکام سے متعلقہ مسائل، مواقع اجماع، شرائط قیاس، مقدمات کو ترتیب دے کر نتیجہ اخذ کرنے

---

[1] عقد الجید، مطبوعہ، کراچی، ص ۹۔ ۱۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور علم عربی کی واقفیت رکھتا ہو، نیز اسے ناسخ و منسوخ اور راویوں کے حالات کا بھی علم ہو۔

عہد حاضر کے ایک اور محقق علامہ محمد ابو زہرہ اس کی حسب ذیل شرائط کا ذکر کرتے ہیں:

"عربیت، قرآن مجید اور اس کے ناسخ و منسوخ کا علم، علم حدیث، مواقع اجماع مواقع اختلاف، قیاس اور مقاصد احکام کی معرفت وغیرہ"[۱]

عصر جدید کے ایک اور نامور محقق علامہ المحمصانی فلسفۃ التشریع الاسلامی میں اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"اجتہاد ہر شخص کے لیے جائز نہیں، بلکہ اجتہاد کرنے کے لیے ان مخصوص صلاحیتوں کا ہونا لازمی ہے۔ جو مجتہد کو اس قابل بنا دیں کہ وہ استخراج احکام اور استدلال کے کام کو کماحقہ انجام دے سکے۔ لہٰذا مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ صائب الرائے، صاحب فہم و فراست، انصاف پسند اور پاکیزہ اخلاق والا ہو اور احکام سمجھنے کی بصیرت تامہ رکھتا ہو، یعنی دلائل شرعیہ اور استنباط احکام کے طریقوں سے واقف ہو۔ اس کے ساتھ زبان پر پورا عبور رکھتا ہو، تفسیر قرآن، اسباب نزول، راویوں کے حالات، جرح و تعدیل کے طریقوں اور ناسخ و منسوخ کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو، الشاطبی نے اس شرط کا بھی اضافہ کیا ہے، کہ وہ مقاصد شریعت سمجھنے کی مہارت تامہ رکھتا ہو"[۲]

متجددین کا خیال ہے کہ یہ شرائط بہت سخت اور کڑی ہیں، اور یہ کہ اجتہاد کی ہر شخص کو اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن شریعت اور احکام شریعت کی حفاظت نیز مجتہد کے اجتہاد کردہ احکام کی کماحقہ قبولیت کے لیے ان کی پابندی ضروری ہے۔ ورنہ تو ہر شخص جو اس کے منہ میں آئے۔ کہے گا اور کوئی کسی کو روکنے ٹوکنے والا نہ ہوگا۔

ان کی پابندی اس لیے بھی لازمی ہے کہ اسلام میں "قانون سازی" کا حق فقط اللہ تعالیٰ اور اس

---

[۱] اجتہاد فی الفقہ الاسلامی؛ نیز اصول الفقہ، ص ۳۷۹ - ۳۹۹ -

[۲] فلسفۃ التشریع الاسلامی، ص ۲۱۵ - ۲۱۶ (اردو ترجمہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص ہے۔ کوئی اور شخص، خواہ وہ خلیفۂ وقت یا اسلامی دنیا کا سب سے بڑا عالم اور مفتی کیوں نہ ہو۔ وہ علی الاطلاق اجتہاد نہیں کر سکتا۔ اور اس کی من پسند باتیں قانون شریعت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ اس کے بجائے، ہر مجتہد کو ایک خاص حد میں رہتے ہوئے اجتہاد کرنے کا حق عطا کیا گیا ہے اور وہ خصوصی حد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ ہیں۔ مجتہد جب بھی اجتہاد کے ذریعے قانون سازی کرے گا، اسے ناگزیر طور پر ان منابع شریعت سے استفادہ کرنا ہوگا۔ اور یہ استفادہ اس وقت تک ممکن اور سہل الحصول نہ ہوگا، جب تک کہ اسے مذکورہ بالا امور میں درک حاصل نہ ہو اور وہ اس طریقے اور اس کے علمی تقاضوں سے واقف نہ ہو، جن کے ذریعے اجتہاد کی شرعاً اجازت دی گئی ہے۔

رہا ڈکشنری دیکھ کر مطالب اخذ کرنے اور اجتہاد کرنے کا مسئلہ، جس پر بعض تجدد پسند بڑا زور دیتے ہیں، تو وہ ایسے ہی ہے۔ جیسے کسی کتاب کو دیکھ کر بیمار کے لیے نسخہ تجویز کرنے یا کسی انجینئرنگ کے مسئلے میں محض کسی کتاب سے استفادے کا مسئلہ۔ کہ ایسے امور میں ایک ایسے ماہر شخص کی ضرورت مسلم ہے۔ جو مطلوبہ فن کی باریکیوں سے کما حقہٗ واقف ہو اور ایسا شخص کوئی سند یافتہ ڈاکٹر اور انجینئر ہی ہو سکتا ہے۔ تو اگر جسمانی علاج معالجے اور اشیاء کی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے محض کتاب کا دیکھ لینا کافی نہیں سمجھا جاتا تو شرعی قانون سازی جیسے اہم اور بنیادی مسئلے میں اسی اہم پہلو کو نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے؟

۱۔ مجتہدین کی درجہ بندی:

پھر اجتہاد کی اہمیت کے پیش نظر مجتہدین کی حسب ذیل درجہ بندی کی گئی ہے:

۱۔ مجتہد مطلق:

مجتہد مطلق سے مراد ایسا فقیہ ہے، جو قرآن و سنہ سے استفادے اور اخذ احکام کے لیے نہ صرف آزادانہ اجتہاد کرے۔ بلکہ اپنے اجتہاد و استنباط کے لیے بھی اپنے اصول و ضوابط کا خود ہی تعین کرے۔ یہ لوگ اس بارے میں کسی امام یا فقیہ کے پابند نہیں ہوتے۔ اس گروہ میں

لہ عقد الجید، ص ۱۵ تا ۱۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ائمہ اربعہ اور پہلی اور دوسری صدی ہجری کے اکابر مجتہدین شامل ہیں۔

ب۔ مجتہد منتسب :

مجتہد منتسب سے مراد ایسے ائمہ کرام ہیں، جو اپنے امام کے اکثر و بیشتر دلائل کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی روشنی میں آزادانہ اجتہاد کریں۔ اس نوع کے تحت ائمہ اربعہ کے قریبی شاگرد اور نامور مجتہدین شامل ہیں۔

ج۔ مجتہد فی المذہب :

یہ لوگ عمومی احکام و مسائل میں تو اپنے امام کی تقلید کرتے ہیں، لیکن جب کوئی نیا واقعہ یا مسئلہ پیش آجائے۔ تو اپنے امام کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کر کے، اس کا حکم تلاش کرتے ہیں۔ جیسے حنفی فقہا میں سے امام طحاوی، امام السرخسی، الجصاص رازی وغیرہ۔

د۔ مجتہد فی الفتویٰ :

یہ وہ لوگ ہیں، جو اپنے مسلک کی پابندی کرتے ہوئے، اپنے امام یا ان کے شاگردوں یا بعد کے مجتہدین کے اقوال کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، عام طور پر ان حضرات کے لیے "مفتی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے[1]

اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ اجتہاد کے لیے نہ صرف اعلیٰ پائے کے علم کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس کے لیے علم میں رسوخ اور وسیع تجربے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کو اپنے اصول کار کا علم نہیں ہے۔ یا اسے دوسرے فقہاء کے اقوال کا پتہ نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور راستے سے بھٹکانے کے لیے کھلی چھٹی نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے اگر اجتہاد کے اس ادارے کو چلانا ہے، تو فقہاء کی مذکورہ بالا طریقے سے تربیت کرنا ہوگی اور انھیں آہستہ آہستہ اس منزل کی طرف لے کر چلنا ہوگا، تاکہ وہ قدم جماتے ہوئے آگے کی طرف بڑھیں۔ اور اگر اس کے برعکس مجتہدین چھوٹتے ہی سب سے اونچے درجے پر پہنچ جائیں۔ اور مجتہد مطلق بن بیٹھیں، تو اس سے شریعت کے نام پر جو بیہودگی اور زندقہ پھیلے گا، اس کا تصور ہی روح فرسا دینے کے لیے کافی ہے۔

---

[1] عقد الجید، ص ۱۵ تا ۱۷؛ المحصانی، فلسفۃ التشریع الاسلامی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ب ۔ بطور مقننہ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کی کارکردگی

رہا یہ سوال کہ اگر مذکورہ بالا اہلیت کو مدار ٹھہرایا جائے، تو پھر مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کا بطور مقننہ ((LEGISLATIVE)) کیا کردار رہ جاتا ہے ؟ حالانکہ مقننہ (LEGISLATIVE)

کسی بھی ملک میں پارلیمنٹ کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے یہی وہ واحد ادارہ ہے جس پر پورے ملک کے لوگ، اپنے ووٹ کا حق استعمال کر کے اعتماد کا اظہار کرتے ہیں:

اور جس میں ملک کے ہر گوشے اور قریب قریب

ہر اہم طبقے کی نمائندگی ہوتی ہے ۔ لہٰذا اگر کوئی مسئلہ اس ادارے کے ذریعے حل کیا جائے، تو اس پر ایک طرح سے پوری قوم متفق ہو سکتی ہے ۔

اس پس منظر میں "قانون سازی" کے لیے مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے اساسی کردار کو نہ تو نظر انداز کرنا ممکن ہے اور نہ ہی اس سے الگ تھلگ کوئی اور راہ ڈھونڈھنا مناسب ہے لہٰذا اگر قوم کسی متفقہ فقہ یا قانون کی خواہش مند ہے ۔ تو اس کے لیے اس ادارے پر اظہار اعتماد کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہتا ۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ادارے کے ذریعے نہ تو فی الوقت درجۂ اجتہاد پر فائز اہل علم منتخب ہو رہے ہیں اور نہ ہی مستقبل قریب یا بعید میں ایسا ہونا ممکن نظر آتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست کے میدانِ کارزار میں جن لوگوں کے جھنڈے نصب ہیں، اور جو کسی نہ کسی پارٹی کے ساتھ وابستہ ہو کر ۔ بہر صورت میں اسمبلی کے ایوان تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں ۔ ان کی اہلیت وصلاحیت کا معیار کچھ اور ہو تو ہو ۔ مگر "فقہی علم" قطعاً نہیں ہے ، اور احادیث کے متعلق ضروری ضروری باتیں بھی معلوم نہیں ہوتیں لہ ان میں سے پڑھے لکھے وہ لوگ کہلاتے ہیں ۔ جو ایک خاص زبان میں بولنے اور لکھنے کی مشق بہم

لہ یہ بات ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ اگر کسی دفتر میں کوئی کلرک یا نائب قاصد بھرتی کیا جاتا ہے ۔ تو اس کے لیے بھی اہلیت کا معیار دیکھا جاتا ہے ۔ لیکن ملک وقوم کی مجلس قانون ساز کے لیے کسی علمی قابلیت و اہلیت کی ضرورت نہیں ۔ پھر ایسی پارلیمنٹ قانون سازی کرے گی ؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچ لیتے ہیں اور بقول مولانا شبیر احمد عثمانی یہ بدیسی زبان انکی کم علمی اور جہالت پر پردہ بن جاتی ہے۔ ان حالات اور اس منظر میں ایسے ایوان کو مطلق قانون سازی کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے؟ اور جن اقوام نے انہیں یہ حق دیا ہے، وہاں کے قوانین کے مطالعے سے اس طریقۂ کار کی قباحت از خود واضح ہو جاتی ہے۔ اور پتہ چلتا ہے۔ کہ ان لوگوں کے سامنے ماسوا اپنے ووٹرز کو خوش کرنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے سوا کوئی اور مقصد ہوتا ہی نہیں۔ حتیٰ کہ انہیں اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی اعلیٰ وارفع اقدار کو بھی قربان کرنا پڑے، تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دنیا کے بعض اعلیٰ تہذیب یافتہ ممالک میں جنس پرستی اور ہم جنسی کی کھلی آزادی، ہمارے اس موقف کا کھلا ثبوت ہے۔ اس لیے اسلام کسی بھی ادارے کو قطعاً کوئی ایسا حق نہیں دیتا، جو اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دے۔ خواہ وہ ادارہ منتخب شدہ ہو یا نامزد کردہ۔

اور اجتہاد کی اہلیت کے متعلق جو پہلی بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس اہلیت کا تعلق کسی بھی صورت میں کسی خاص عہدے منصب سے نہیں ہے خواہ اسے یہ عہدہ بذریعہ انتخاب حاصل ہوا ہو یا بذریعہ نامزدگی۔ اس کا تعلق تو مکمل طور پر متعلقہ فرد کی قابلیت اور اہلیت سے ہے۔

ہمارے زمانے میں اس بات کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمارے اس زمانے میں شرافت اور بزرگی کی قدریں اور معیار بدل چکے ہیں۔ ہمارے اسلاف کے زمانے میں جن باتوں کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی، وہ اب ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اور جن باتوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ یا انہیں منفی اہلیت تصور کیا جاتا تھا، وہی باتیں اب اولیت اور اولویت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، اس لیے کسی بھی کرسی یا منصب پر بیٹھنے والا شخص دنیوی طور پر تو عزت و احترام اور عقیدت و محبت کا مرجع ہو سکتا ہے، مگر دینی اور شرعی پہلو سے اس کو اس وقت تک پذیرائی نہیں مل سکتی، جب تک کہ اس میں شریعت کی مطلوبہ صفات اور اوصاف پیدا نہیں ہو جاتیں۔ اس لیے محض ظاہری مشابہت کسی بھی منصب دار کی اہلیت کا فیصلہ کرنے میں بنیاد تصور نہیں کی جا سکتی۔ مثال کے طور پر اگر آج کے زمانے میں کسی صوبے کا گورنر دینی اور شرعی پہلو سے بے بہرہ ہو، تو اسے محض اس لیے اجتہاد اور شرعی قانون سازی کا حق نہیں دیا جا سکتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر مقرر کرتے ہوئے یہ حق تفویض فرمایا تھا۔ یہ کسی کورٹ کا چیف جسٹس محض اس لیے ائمہ مجتہدین کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ "قاضی القضاۃ" کے منصب عظمیٰ پر فائز ہے، حتیٰ کہ اس میں قاضی ابو شریح، قاضی ابن ابی لیلیٰ اور قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کی طرح، مطلوبہ اجتہادی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یا کسی بھی حکومت کا سربراہ (HEAD) محض اس بنا پر "مجتہد مطلق" ہونے کا دعویدار نہیں ہو سکتا کہ اس کا یہ منصب ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ کے مناصب کے مماثل ہے، تا وقتیکہ اس میں مذکورہ اوصاف پیدا نہیں ہو جاتے۔

ہمارے اس موقف کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ درجۂ اجتہاد پر فائز صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعین۔ ہر طرح کے سیاسی اور قومی مناصب سے محروم ہونے کے باوجود بھی مرتبہ اجتہاد پر فائز رہے اور ان کے اجتہادی احکام کو ایک دنیا نے قبول کیا، حالانکہ ان سے بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگوں کا نہ اس زمانے میں ایسا کوئی مقام تھا، اور نہ ان کے بعد، انھیں یہ مقام دیا گیا۔

عہدوں اور مناصب کے حوالے سے کسی کو مرتبۂ اجتہاد پر فائز کرنے کی یہ کوشش انتہائی خطرناک ہی نہیں۔ بلکہ اسلامی تاریخ کے مسلمہ شواہد و واقعات کے بھی سراسر خلاف ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ سلسلہ آج بحال کر دیا جائے اور یہ باور کر لیا جائے، کہ جس شخص کو پچاس ہزار یا ایک لاکھ انسانوں نے اپنی ترجمانی کے لیے منتخب کر لیا ہے، اُسے اجتہاد کا حق حاصل ہو گیا ہے اور وہ جس طرح کا چاہے اجتہاد کر سکتا ہے، تو پھر یزید، حجاج بن یوسف اور عبید اللہ بن زیاد جیسے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ انہیں مجتہد مطلق تسلیم نہ کیا جائے اور ان کے سیاسی مخالفین کو، جن میں بہت سے نامور صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان کے اجتہاد سے انحراف کرنے کا کیوں نہ مجرم تصور کیا جائے؟ اسی طرح یزید کے متعلق ہمیں متعدد تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ تین افراد کے سوا تمام لوگوں نے اس کی بیعت کر لی تھی اور بیعت کرنا ووٹ دینے سے اظہار اعتماد کا زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود اگر اس اظہار اعتماد کے باوجود اسے شرعی معاملات میں "مجتہد" تسلیم نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پر امور شریعت سے انحراف کرنے کا الزام ہے، تو اس سے ثابت ہوا کہ محض "انتخاب" یا "اظہار اعتماد" کسی فرد کو درجۂ اجتہاد تک پہنچانے کا ذریعہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے "مجلس شوریٰ" "قومی اسمبلی" کو اجتہاد کا حق مطلقاً نہیں دیا جا سکتا، البتہ چونکہ اس کی حیثیت مقننہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(LEGISLATIVE) کی بھی ہے، لہٰذا اسے ایک خاص حد میں رہتے ہوئے اپنے اس حق کے استعمال کرنے کا مجاز تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی شریعت میں پارلیمنٹ کی قانون سازی کی حدود

اسلامی شریعت میں پارلیمنٹ کی قانون سازی کو ابتداءً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ا: عمومی نظم و نسق :

ب: خصوصی شرعی قانون سازی :

ان میں سے ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا: عمومی نظم و نسق سے متعلقہ قانون سازی :

باوجودیکہ شریعت اسلامیہ "قانون الٰہی" ہے پھر بھی اسلامی حکومتوں کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ "رفاہِ عامہ" کے پیش نظر شریعت طیبہ نے مسلمان حکمرانوں کو براہِ راست قانون سازی کے خصوصی اختیارات تفویض کیے ہیں، ہمارے اس زمانے میں چونکہ حکمرانوں کا حق قانون سازی "پارلیمنٹ" کے دونوں ایوان کو تفویض کر دیا گیا ہے اور حکمران وقت ذاتی حیثیت میں کسی قسم کی قانون سازی کا مجاز نہیں ہے، اس لیے ہم شریعت کے حکمرانوں کو تفویض کردہ قانون سازی کے اختیارات کا، الٰہی کو نمائندہ اور ترجمان قرار دے سکتے ہیں۔

اس قسم کی قانون سازی کا جواز اور عوام الناس کے لیے اس کا واجب الاتباع ہونا قرآن و سنہ اور اجماع کی تینوں دلیلوں سے ثابت ہے۔

قرآن مجید سے اس طرح کہ اس میں ارشاد باری تعالیٰ :

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ [1]

ترجمہ: اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی، اس کے رسول کی اور تم میں جو حکمران ہیں۔ ان کی۔

رہی حدیث نبوی سے دلیل، تو اس سے مراد، بخاری و مسلم اور دیگر کتب حدیث کی روایت کردہ

---

[1] النسآء - ۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ حدیث ہے :

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ من کرہ من امیرہ شیئاً فلیصبر علیہ فانہ لیس احد من الناس خرج من السلطان شبراً فمات علیہ الا مات میتۃ جاھلیۃ الا من ولی علیہ وال فراہ یاتی شیئاً من معصیۃ اللہ فلیکرہ ما یاتی من معصیۃ اللہ ولا ینزعن یداً من طاعتہ[1]

ترجمہ : جس نے میری اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے اپنے حاکم کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اپنے حاکم کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔ سنو اور اطاعت کرو، اگرچہ تم پر کوئی حبشی غلام ہی حاکم کیوں نہ بنا دیا جائے، جس کا سر منقی کی طرح (سیاہ) ہو، جس شخص کو حاکم کی کوئی بات ناگوار ہو، تو وہ صبر (برداشت) سے کام لے، اس لیے کہ جس شخص نے اپنے امیر کی ذرا سی بھی مخالفت کی اور پھر وہ اسی حالت میں مر گیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا، یاد رکھو جس پر کوئی حاکم مقرر ہو، اور وہ اس حاکم کو اللہ کی نافرمانی کرتا ہوا دیکھے، تو وہ اس کو اپنے دل میں برا سمجھے، لیکن اپنا ہاتھ اس کی اطاعت سے نہ کھینچے۔

اسی طرح اجماع امت سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہر دور میں مسلم حکمرانوں اور خلفاء نے بہت ایسے معاملات و مسائل میں اجتہاد کیا اور غور و فکر سے احکام صادر کیے، جو انہیں وقتی ضروریات کے لحاظ سے اکثر پیش آیا کرتے تھے۔ اور چونکہ امت نے اجماعاً ان کے اس حق کو تسلیم کیا، اس لیے ان کا یہ حق اب شریع اسلامی کا ایک جزو بن گیا ہے

---

[1] البخاری : الجامع البخاری، مع شرح عینی، (۱۴/۲۲۳ ؛ ۲۴/۲۲۴، ۸، ۲۷/ صحیح مسلم، (۶/۱۳ - ۲۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے امور میں مختلف محکمہ جات کا قیام، ان کے لیے کارکن عملے کا تقرر، ان کے اختیارات و حدود کی تعین، محصولات وغیرہ کی تشخیص، خراج اور ارضی محصولات کی وصولی، جیل خانوں کی تنظیم و تاسیس، مختلف علاقوں کا انتظامی عملہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ "سیاست شرعیہ" (قانون تعزیرات) بھی اسی فہرست کا حصّہ ہے، جس میں بطور خاص محتسب کے فرائض اور دیگر احتسابی عملے کی تقرری وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس نوع کے احکام کا مقصد امن و امان کا قیام اور لوگوں کے معاملات کی تنظیم و تدبیر سے ہے، اس لیے یہ تمام ان کے دائرۂ اختیار میں آتے ہیں، کہ پارلیمنٹ جس قسم کا مناسب سمجھے، بحث و تمحیص اور غور و فکر کے بعد، فیصلہ صادر کرے۔ ایسے ہر فیصلے کی پابندی اسی طرح لازمی ہوگی، جس طرح کہ دیگر احکام شریعت کی پابندی لازم ہے۔

اس نکتے کی مزید تشریح یہ ہے کہ اسلام نے انتظامی اور رفاہ عامہ کے امور میں بنیادی احکام کی تعیین کر کے۔ ان کی جزئیات اور تفصیلات طے کرنے کا کام از خود حکمرانوں کی ذمہ داری قرار دیا ہے تاکہ وہ موقع محل اور رفتار زمانہ دیکھ کر جو فیصلہ بھی مناسب سمجھیں صادر کریں، اور رعایا کو جس جس طرح سہولت اور فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ پہنچائیں[1]۔ چنانچہ اس اجازت کے تحت اس قسم کی قانون سازی ہر حکمران وقت نے کی اور اس کا نفاذ کیا۔ بلکہ اسلام چونکہ عوام کی فلاح و بہبود کو اپنی سیاست کی اساس قرار دیتا ہے، اس لیے مسلم خلفاء سیاست شرعی اور مصلحت عامہ کے پیش نظر قرآن و سنۃ کے بعض احکام وقتی طور پر معطّل کر دینے میں بھی پس و پیش نہ کرتے تھے، مثال کے طور پر حضرت عمر فاروق رضؓ کے زمانے میں جب قحط پڑا اور لوگوں کو زندگی بچانے کے لیے اناج کا حصول مشکل ہو گیا، تو انہوں نے قحط دور ہونے تک چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا کو معطل فرما دیا۔ اسی طرح جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اب اسلام کی شان و شوکت اچھی طرح ثابت اور استکار ہو چکی ہے، تو انہوں نے زکوٰۃ کے مصارف میں سے "مؤلفۃ القلوب" کے حصّے کو موقوف فرما دیا۔ حالانکہ اس کی تعیین خود قرآن مجید میں مذکور تھی۔ اسی طرح انہوں نے احادیث میں زانی کے لیے ایک سال تک جلا وطنی کی سزا اس لیے معطّل فرما دی۔ کہ ایک ایسے ہی جلا وطن کردہ شخص کے مرتد ہو کر۔ رومیوں سے مل جانے کی اطلاع ملی تھی[2]۔ اس عہد میں اسی طرح کے دیگر واقعات کافی ہیں

---

[1] ابن خلدون، مقدمہ، ص ۱۹۶؛ السرخسی؛ المبسوط، ۲۶/۱۲۴۔

[2] المحمصانی، فلسفۃ التشریع الاسلامی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پتہ چلتا ہے۔

اسی طرح ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ عثمانی خلفاء نے اپنی نگرانی میں "مجلۃ الاحکام العدلیہ" کی تدوین کرائی، جس میں قانون سزا و جزاء، قانون تجارت اور عدالتوں کے اساسی قوانین، کے لیے معاصر یورپین اقوام سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ "پارلیمنٹ" کو امن و امان کے قیام، نظم و نسق کی تدبیر و تنظیم اور محصولات وغیرہ کی تعیین و تنفیذ کے لیے لامحدود اختیارات حاصل ہیں، وہ اپنے ان اختیارات کا قانون سازی کے ذریعے اظہار و نفاذ کر سکتی ہے۔ تاہم اس مقصد کے لیے بھی مناسب ہوگا کہ پارلیمنٹ کی معاونت اور رہنمائی کے لیے ماہرین قانون اور جدید علمائے کرام پر مشتمل ایسی کمیٹی یا بورڈ تشکیل دیا جائے، جو ان معاملات میں قرآن و سنہ کی روشنی میں حدود و کار کی تعیین کرے اور پارلیمنٹ کے کام کو آسان بنائے۔ جیسا کہ علامہ المحمصانی اپنی کتاب فلسفۃ التشریع الاسلامی میں تحریر فرماتے ہیں:

"سلطانِ وقت کے شرعی اختیارات کے مقرر کردہ حدود اور شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ انتظامی امور میں اہل بصیرت سے مشورہ کرے۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (اے رسول آپ مسلمانوں کے معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہا کریں) اور (دوسری جگہ فرمایا): وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ، (یعنی مسلمانوں کا معاملہ باہمی مشورے سے طے ہونا چاہیے)! امام بخاریؒ نے روایت نقل کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض معاملات میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ مجتہدین ایسے جائز معاملات میں۔ جن کے لیے قرآن و حدیث میں ایسا حکم نہ ملتا تھا۔ جسے اساس قرار دے سکیں، تو وہ دیانت دار اہل علم سے مشورہ لیتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق خاص طور پر مذکور ہے کہ وہ دوسروں سے مشورہ لینے اور استصواب رائے میں سب سے زیادہ مشہور تھے[۱]"

الغرض ملک و ملت کے وسیع تر مفاد میں، یہ بات عین قرین انصاف ہے۔ کہ ایسے معاملات

---

[۱] فلسفۃ التشریع الاسلامی، ص ۲۹۳ - ۲۹۴، بحوالہ اعلام الموقعین، ۱: ۷۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی پارلیمنٹ حتمی فیصلہ کرنے سے قبل ماہرین قانون اسلامی سے بھی مشاورت کرے اور اس کی روشنی میں حتمی فیصلہ کرے۔

۲۔ خصوصی شرعی قانون سازی

خصوصی شرعی قانون سازی سے مراد یہ ہے کہ پارلیمنٹ کسی ایسے مسئلے میں قانون سازی کرے جس کا تعلق خالصتاً شریعت اسلامیہ سے ہو۔ ایسے مزید دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اوّلاً ایسے احکام و مسائل جن کا شریعت اسلامیہ میں قطعی اور دو ٹوک فیصلہ موجود ہو، ثانیاً ایسے احکام و مسائل جن کے متعلق ہمیں دو ٹوک فیصلہ نہ ملتا ہو، یا فیصلہ تو موجود ہو، البتہ اس کی توضیح و تشریح کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہو۔
اگر تو اس کا تعلق ایسے احکام و مسائل سے ہو، جن کے متعلق قرآن و سنت یا اجماع اُمّت نے قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہو، تو ایسے مسئلے میں پارلیمنٹ کو قطعاً قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہے اور اگر اس نے ایسا کیا۔ تو یہ اسلام کے خلاف کھلم کھلا بغاوت ہوگی، اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں اسلام ہمیں کسی بھی طاقت کے سامنے سر جھکانے اور اس کی بات من و عن تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

انما الطاعة فی المعروف

ترجمہ: حاکم کی اطاعت تو فقط نیک کاموں میں ہی کرنی چاہیے۔

اسی طرح ایک اور حدیثِ نبوی میں ارشاد ہے:

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق[1]

ترجمہ: بندے پر ایسے کسی حکم کی تعمیل ضروری نہیں، جس میں خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو۔

اسی طرح کی ایک اور حدیثِ نبوی کا مضمون ہے کہ:

السمع والطاعة حق ما لم يؤمر بالمعصية فاذا امر بمعصية

---

[1] السیوطی: جامع الصغیر، (حدیث ۳-۹۹) بحوالہ مسند احمد بن حنبل اور مستدرک حاکم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلا سمع ولا طاعة [1]

ترجمہ: حکم کی اطاعت اسی وقت تک ضروری ہے۔ جبتک وہ برائی کا حکم نہ دے اور اگر اس نے برائی (معصیت) کا حکم دیا۔ تو اس کے اس حکم کی تعمیل نہ کرنی چاہیئے۔

ان ارشادات نبویہ سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "مسلمان" پہلے اپنے خدا و رسول کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور ثانیاً اپنے حکمرانوں کے احکام کی۔ اگر حاکم کوئی ایسی بات کرنے کو کہے جو قرآن و سنہ کی نصوص سے متصادم ہو، تو مسلمان اپنی جان پر تو کھیل سکتا ہے، خدا و رسول کے احکام کی نافرمانی کا تصور نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر اس مسئلے میں شریعت طیبہ میں کوئی حکم نہ ملتا ہو، مثال کے طور پر ہیروئن فروش یا ہیروئن نوش وغیرہ کی سزا وغیرہ۔ یا پھر اس کا حکم تو موجود ہو، البتہ اس کی توضیح و تشریح درکار ہو، مثال کے طور پر زکوٰۃ، دیت، سرقہ اور مہر وغیرہ کے نصاب کا مسئلہ، یا مسکین اور فقیر وغیرہ کی توضیح و تشریح کا حکم۔ کہ ان امور کا اگرچہ قرآن مجید میں ذکر موجود ہے، لیکن چونکہ ان کا تعلق نقدی سے ہے، اس لیے ان کے نصاب کی تعیین و تشریح کی گنجائش موجود ہے اور چونکہ ان کی توضیح و تشریح ان احکام سے متصل ہو گی، لہٰذا اس طرح یہ قانون سازی "حدود شریعت" میں داخل ہے۔

دوسری طرف "ممبران پارلیمنٹ" کا اپنا اسلامی ذہن یا ان کے پاس دینی معلومات کا ذخیرہ نہیں ہوتا، لہٰذا وہ اجتہاد و استنباط کے اساسی قواعد و ضوابط اور ماخذ اربعہ (قرآن، سنہ اجماع اور قیاس) سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر ان سے استفادہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لیے اگر یہاں بھی انہیں اجتہاد اور قانون سازی کا حق دے دیا جائے، تو اس سے دور رس منفی اثرات پیدا ہوں گے۔ دوسری طرف انہیں اس حق سے محروم کرنا بھی قوم و ملک کے وسیع مفاد کے خلاف ہو گا۔ اس لیے اس مسئلے کے حل کے لیے درمیانی راہ اختیار کرنا ناگزیر ہو گا۔

درمیانی راہ یہ ہے کہ حکومت نامور علمائے دین اور ماہرین قانون پر مشتمل ایسی کمیٹی یا بورڈ (Board) تشکیل دے، جو "اجتہاد" کے درجے پر فائز ہوں اور ملک کے دینی و مذہبی حلقوں میں نیک نام بھی ہوں، ان کی یہ تقرری نہ تو سیاسی بنیادوں پر ہو اور نہ ہی فرقہ وارانہ اساس پر، بلکہ

---

[1] البخاری مع شرح عینی، ۱۴/۱۷، ۳۱۴/۱۷؛ صحیح مسلم، ۱۵/۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی نامزدگی خالصتاً علمی اور تحقیقی بنیادوں پر ہو۔ یہ لوگ لومۃ لائم کی پرواکیے بغیر دینی امور کی انجام دہی میں نیک شہرت کے مالک ہوں۔

پھر جیسے ہی حکومت قانون کا کوئی مسودہ تیار کرے، تو سب سے پہلے اس بورڈ کے سامنے پیش کرے اور اس سے مشاورت اور رائے لینے کے بعد، اسے حتمی اور قطعی منظوری کے لیے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر پارلیمنٹ اپنے اجتہاد اور قانون سازی کے حق سے محروم بھی نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ ساتھ اجتہاد اور اس کے لوازم کی پابندی بھی ممکن حد تک کی جاسکتی ہے۔

ISLAMIC IDEOLOGICAL COUNCIL

فی الوقت ہمارے ملک میں اسلامی نظریاتی کونسل ( ) کے نام سے ایک ادارہ موجود ہے۔ تاہم اس ادارے کو "عضو معطل" بنانے یا ایک حد میں محدود کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس ادارے کو پارلیمنٹ کے ساتھ وابستہ کیا جائے اور اس کی ماہرانہ آرا کو فوری طور پر قانون کا درجہ دے دیا جائے، جبکہ فی الوقت اس کونسل کو محض جزو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ "اسلامی نظریاتی کونسل" میں سیاسی یا فرقہ ورانہ بنیادوں پر جو تقرریاں اور نامزدگیاں کی جاتی ہیں، اس پر بھی نظرثانی کی ضرورت ہے، اس ادارے میں صرف اور صرف اہل لوگوں کا تقرر کیا جائے۔ اور اس میں مختلف طبقوں کے لوگوں کو بھی نمائندگی دی جائے، تاکہ اس کی سفارشات زیادہ مؤثر اور مربوط بنائی جاسکیں۔

یہ کونسل مختلف امور و مسائل میں باہمی مشاورت اور بحث و تمحیص کے علاوہ ملک کے متقدر اور جید علمائے کرام اور ماہرین قانون سے بھی مشاورت کرے اور ان سب کی آرا سے استفادے کے بعد۔ کامل غور و خوض کے ساتھ اپنی سفارشات مرتب کرے۔ اس کی سفارشات کو حکومت قانون کا درجہ دے کر، ملک میں نافذ کرے۔

۱۱۔ قانون سازی کے لیے لائحہ عمل

مذکورہ بالا طریقے سے، یعنی جید علمائے کرام اور ماہرین قانون کی مشاورت سے پارلیمنٹ جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قانون سازی کرے گی ۔ وہ یقیناً ایسی قانون سازی ہوگی ، جسے پورا ملک قبول کرے گا ، اور اس کے سامنے تمام لوگوں کی گردنیں جھک جائیں گی ۔ اور چونکہ مذکورہ بالا کونسل میں جدید علمائے کرام اور ماہرین قانون موجود ہوں گے ، لہذا وہ اپنی راہ از خود متعین کر سکتے ہیں اور اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کر سکتے ہیں ۔ تاہم ان کے لائحہ عمل پر بھی چند سطور میں اظہار خیال کرنا مناسب ہوگا ۔

ہمارا ملک چونکہ اسلامی شریعت و قانون اسلامی کی راہ پر پہلی مرتبہ گامزن ہو رہا ہے اور فی الوقت عوام کی طرف سے جو رد عمل سامنے آیا ہے ، وہ مکمل طور پر اسلامی قانون کے حق میں ہے ، اس لیے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام الناس کی یہ شدید خواہش ہے کہ ملک میں جلد از جلد اسلامی قانون نافذ ہو ، لہذا حکمرانوں کو جلد یا بدیر اس مطالبے کو پورا کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ۔

اس بارے میں سب سے اولین مسئلہ لائحہ عمل طے کرنے کا ہے ۔ ہمارے خیال میں اس کے لیے حسب ذیل لائحہ عمل ہونا چاہیے :

۱ ۔ ترکی اور مصری تجربے سے استفادہ :

جیسا کہ سطور بالا میں مذکور ہوا اسلامی قانون سازی کے میدان میں ترکی اور مصر ہم سے سابقت رکھتے ہیں اور یہ کہ دور جدید میں قانون شریعت کے نفاذ کا اولین تجربہ انہی ممالک میں کیا گیا ۔ اس لیے ہمارے ملک میں قانون سازی کے میدان میں جو کوششیں ہو رہی ہیں ، ان میں ان کے اس تجربے کو پیش نظر رکھا جائے ۔

ترکی میں اور ترکی کے مقبوضات میں " مجلۃ الاحکام العدلیہ " کے نام سے ایک مجموعہ قوانین مرتب کیا گیا تھا ، اسے یہاں قانون سازی کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ قدری پاشا مرحوم اور دیگر مصری علماء کے گرانقدر کاوشوں کو بھی اساس قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح یہاں کے قانون ساز اداروں کو ایسی مضبوط اساس مہیا ہو جائے گی ، جس پر مسلم امہ ایک عرصے سے عمل پیرا رہی ہے ۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ مجلۃ الاحکام العدلیہ یا اسی طرز کی دیگر قانونی کتب کو من و عن اپنا لیا جائے ۔ بلکہ اس میں حسب ضرورت و مصلحت ترمیمات یا اضافات کر کے انہیں اپنے ملکی اور علاقائی حالات کے لیے سازگار بنا لیا جائے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ب ۔ دیگر علماء کرام کی کاوشیں :

اس عنوان پر دیگر علمائے کرام اور فقہاء نے جو کاوشیں کی ہیں ، انہیں بھی اپنے غور وخوض کی بنیاد ٹھہرایا جائے ۔ بالخصوص امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، شاہ عبدالعزیز ، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی وغیرہم نے جو رہنما اصول کار مقرر کیے ہیں ۔ ان پر نظر رکھی جائے ۔ اسی طرح جسٹس تنزیل الرحمان نے "مجموعہ قوانین اسلام" کے عنوان سے جو ایک مبسوط قوانین کا مجموعہ تیار کیا ہے ، اسے بھی اساس ٹھہرایا جائے ۔

ج ۔ بین المسلکی انداز :

پھر قانون سازی کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ قانون سازی کے وقت ، ماہرین قانون خود کو کسی خاص فقہ یا مسلک تک محدود نہ رکھیں ۔ بلکہ اہلسنت والجماعت کے چاروں مسالک کو پیش نظر رکھیں اور حالات زمانہ اور ضرورت کے مطابق جس موقف یا مسلک کو قرآن وسنہ کے زیادہ موافق پائیں ، اس کو اپنالیں ۔ جیسے کہ ترکی اور مصر میں اسی طرز پر کام ہو چکا ہے ، اس طریقہ کار سے قانون میں توسع اور عالمگیریت کی شان پیدا ہوگی اور قانون عصری تقاضوں کا چیلنج قبول کرنے میں کامیاب ہو سکے گا ۔

د ۔ جدید تصورات سے استفادہ :

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جو قانون سازی بھی کی جائے ، اس میں جدید عصری تقاضوں اور تصورات سے بھی بھرپور استفادہ کیا جائے ، کیونکہ جب تک عصری تصورات اور جدید تقاضوں کو سامنے نہیں رکھا جائے گا ، اس وقت تک کسی بھی قانون کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن نہ ہوگا ۔ جیسا کہ ترکی اور مصر وغیرہ ممالک میں اس بارے میں تجربہ کیا جا چکا ہے ۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ استفادہ ایک خاص حد تک ہو ۔ اور وہ اس حد سے تجاوز کرنے نہ پائے ۔ اس لیے کہ اگر دور جدید کے تصورات ہمارے اسلامی اور مذہبی تصورات پر غالب آگئے ، تو پھر یہ قانون سازی بے معنی ہوگی ۔

ھ ۔ اسلام کے رفاہی پہلو کی تقدیم :

پھر جیسا کہ اوپر بیان ہوا ۔ قانون سازی کے لیے ضروری ہوگا ۔ کہ اسلام کے رفاہی اور بہبود عامہ کے تصورات کو فوقیت دی جائے ۔ اور قانون سازی کا مقصد لوگوں کا عرصۂ حیات تنگ کرنے کے بجائے ، انہیں سہولتیں اور فوائد بہم پہنچانا ہو ۔ جیسا کہ فرمان نبوی ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بشِّرُوا ولا تنفروا یَسِّرُوا ولا تُعَسِّرُوا ۔

ترجمہ : تم لوگوں کو بشارتیں سنانا اور متنفر نہ کرنا ، اور آسانی پہنچانا اور سختی نہ کرنا۔

اور چونکہ یہ قانون سازی کرنے والوں اور اس کا نفاذ کرنے والوں پر موقوف ہے کہ وہ عصرِ جدید میں اسلام کو کس روپ میں پیش کرتے ہیں ۔ لہٰذا انہیں مذکورہ بالا فرمان نبوی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور اسی کو قانون سازی کی بنیاد ٹھہرانا چاہیے ۔

© rasailojaraid.com